گوہر سُفتہ

(گلدستۂ انشائیہ)

غلام حسن طالب

گوہرِ سُفتہ

(گلدستہ انشائیہ)

مصنف

غلام حسن طالبؔ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۲

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ!

GOWHAR-E-SUFTA
BY : Ghulam Hasan Talib
Year of Edition 2024
ISBN 978-93-6062-275-6
Price ₹ 400/-

نام تصنیف	:	گوہرِ سُفتہ (گلدستۂ انشائیہ)
مصنف	:	غلام حسن طالبؔ
طبع اول	:	۲۰۲۴ء
صفحات	:	۱۷۶
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۴۰۰ روپے
کمپیوٹر کتابت	:	میر پرویز 9697476370,9469155007#
طباعت	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کا پتہ

۱۔دین و دُنیا کتاب گھر و پبلشنگ ہاؤس، نیوہ پلوامہ ۲۔ متصل اے ٹی ایم جموں و کشمیر بنک نیوہ (پلوامہ) کشمیر

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.O. D1/16,Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002(INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 011-41418204,45678286,45678203 ,23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے آبائی گاؤں ملہ واری (نیوہ) کے ایک
صاحب دل، خوش کلام اور نفاست پسند بزرگ
خواجہ محمد رمضان بٹ (مرحوم) المعروف "رمضان
گرٹہ وول" کی یاد میں، کہ جن کی ظرافت آمیز گفتگو
سے میرے اندر کا ادیب نیم سنجیدہ ہلکے پھلکے
مضامین لکھنے کے لئے جاگ اُٹھا

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔	عرضِ مصنف / غلام حسن طالبؔ	07
۲۔	''گوہرِ سُفتہ'' کے گوہر پارے / ڈاکٹر گلزار احمد وانی	13
۳۔	حرفے چند / ڈاکٹر محمد اشرف	24
۴۔	کرسی	29
۵۔	انتظار	34
۶۔	جان پہچان	39
۷۔	ریٹائرمنٹ	45
۸۔	بڑھاپا	51
۹۔	چہرے	56
۱۰۔	صبر	61
۱۱۔	دِل	67
۱۲۔	شرافت	72
۱۳۔	راستہ	77
۱۴۔	نمک اور شکر	82

۱۵۔	خانہ داری	88
۱۶۔	نام ساکھ	94
۱۷۔	پروا	103
۱۸۔	آنکھیں	109
۱۹۔	سایہ	115
۲۰۔	گالی گلوچ	120
۲۱۔	ساعتیں	126
۲۲۔	لوح وقلم	132
۲۳۔	مجبوری	137
۲۴۔	چھتری	142
۲۵۔	فرصت	148
۲۶۔	زبان	155
۲۷۔	کتاب	161
۲۸۔	لائف سِٹائل	167
۲۹۔	خوشامد یا چاپلوسی	173

❖❖❖

وزیر آغا

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں تھا
حدِ اُفق پہ شام تھی خیمے میں منتظر
آنسو کا اک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا
لو وہ بھی نرم ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو ایک کوہ گراں رہگذر میں تھا
پاگل سی اک صدا کسی اُجڑے مکان میں تھی
کھڑکی میں اِک چراغ بھری دوپہر میں تھا
اس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ پوش
سورج کا اِک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

عرضِ مصنف

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکتا ہے کہ ایک ادیب اپنی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرنے کے دوران کائینات کا مشاہدہ کرنے سے تجربے حاصل کرتا ہے اور پھر ان تجربوں کی روشنی میں اپنے ذہن میں سمیٹے افکار و تصورات کو کسی بھی من پسند صنفِ نثر کے سانچے میں اظہار کی زبان دے سکتا ہے۔ جہاں تک طبع زاد لکھنے یعنی کہ تخلیقی ادب کا تعلق ہے اس کے ذریعے کوئی بھی نئی چیز، نئی ترکیب یا نیا نظریہ لفاظی طور تشکیل پاتا ہے۔ ایسے قابل قدر لفظی ڈھانچے کو ہم تخلیقی ادب کہہ سکتے ہیں، چونکہ ادب کی تعریف کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ ادب تین حرفوں کا لفظ ہے۔ جو لامحیط ہے۔ کوئی ادب کو سماج کا آئینہ تو کوئی دستورِ حیات قرار دیتا ہے۔ بعض حضرات اس کو تفسیر حیات یا آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ دراصل ادب کی عمارت کے تین اہم ستون تخلیق، تحقیق اور تنقید ہیں جن پر یہ کھڑا ہے۔ ان تینوں میں گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ادب پر ایک نیا سوال آج بھی ذہنوں میں اُبھرتا ہے کہ کیا ادب ایک تخلیقی سرگرمی ہے یا یہ محض ایک سماجی سرگرمی تک محدود ہے۔ بحث طلب معاملات کو ایک طرف چھوڑ کر مجھے لگتا ہے کہ

ایک تخلیق کار صرف وہی کچھ بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتا جو کچھ ہو چکا ہو بلکہ اس کی نظر اپنے سامنے موجودہ اور آئیندہ آنے والے حالات پر بھی مرکوزِ خاطر ہوتی ہے۔

بہر حال اس بات کی وضاحت کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ادب کی اگر کوئی صنف ایک ذہن رسا تخلیق کار کو دعوتِ اظہار دیتی ہے تو وہ انشائیہ کا فن ہے جس میں مقالے، مضامین اور مزاحیہ یا نیم مزاحیہ تخلیقات شامل نہیں ہوتی ہیں۔ انشائیہ کے لئے ایک خاص آزادانہ طرز تحریر مستعمل ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح زندگی کی کوئی ایک تعریف پیش کرنا ممکن نہیں اسی طرح انشائیہ کی کوئی ایک اور حتمی تعریف بیان کرنا ممکن نہیں۔ انشائیہ کے لغوی معنی "عبارت" ہے یہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون یا مقالہ کی مانند لگتی تو ہے مگر اِن سے بالکل ایک علاحدہ انداز رکھتی ہے۔ اس فن کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ انشائیہ نگاری بے گانہ روی اور خود مختاری کا فن ہے۔ انشائیہ تحریر کرتے وقت قلم اور دل سے عقل کی پاسبانی اٹھا دی جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر لوح پر ایک بہترین انشائیہ رقم کیا جاسکتا ہے۔ انگریزی میں انشائیہ اور مضمون دونوں کے لئے essay کی اصطلاح رائج ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کی عام یا خاص بات یا کیفیت اپنی افتادِ طبع، علمیت اور شگفتہ نگاری سے پر لطف انداز میں بیان کرتا ہے۔ گویا وہ اپنے خیالات آزادانہ طور اپنی تحاریر میں پیش کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔ کسی

خاص نتیجہ پر پہنچے بغیر بات کو ختم کرتا ہے۔ نتیجہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے۔
وزیر آغا زاپنی کتاب ''انشائیہ کے خدوخال'' میں لکھتے ہیں:

''ہر صنف بجائے خود ایک طرح کی کائینات اصغر ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ لکھنے والا اس کائنات کے اندر سفر کرے اور اس سفر کے دوران اس صنف کا مسلسل عرفان حاصل کرتا رہے۔ ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے ممیز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں ردو قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے''۔

بہر حال انشائیہ اُردو ادب کی ایک نہایت ہی لطیف صنف ہے۔ کسی ایک مضمون کو جب ایک خاص انداز میں تحریر کیا جاتا ہے جس کی بے ترتیبی کا اپنا ایک ربط ہوتا ہے اور بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے''۔

ڈاکٹر جاوید وشِشٹ نے ملا وجہی کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے۔ وہ انشائیہ کو ایک دیسی صنف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اُردو انشائیہ اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ سرسید کے دور میں انگریزی ادب سے ہمارے انشائیہ نے ضرور استفادہ کیا مگر یہ کہنا غلط ہے کہ اُردو انشائیہ انگریزی انشائیہ سے آیا ہے''

انہوں نے منشی پریم چند کے انشائیہ ''گالیاں'' سے وحید قریشی کے حوالے سے یہ چند سطور نمونہ کے طور پیش کی ہیں۔

''یوں تو گالیاں بکنا ہمارا سنگھار ہے۔ مگر بالخصوص عالم غیض و غضب میں ہماری زبان جولانی پر ہوتی ہے۔ غصہ کی گھٹا سر پر منڈلاتی اور منہ سے گالیاں موسلا دھار مینہ کی طرح برسنے لگتی ہیں''۔

عہد زرین کا آغاز ڈاکٹر وزیر آغاز سے ہی ہوتا ہے ان کا انشائیہ کے اصول و ضوابط متعین کرنے اور اس صنف کو بحیثیتِ صنف کے برتنے اور رائج کرنے کے حوالے سے سب سے اہم نام ہے۔ انہوں نے انشائیہ کو اس کی پہچان دلوائی اور انشائیہ کو عصری بنیادوں پر گفتگو کا موضوع بنایا۔ اس مقصد کے لئے ''انشائیہ کے خدوخال'' کے عنوان سے ایک مکمل اور جامع کتاب تحریر کر کے انشائیہ کا دستور مرتب کیا اور خود بھی ان اصولوں کی بنیاد پر انشائیے تحریر کئے۔

راقم نے ایک کالم نویس اور کیجول ریڈیو آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے لگ بھگ پچاس سالہ ادبی سفر کے دوران مقالے، مضامین اور تھوڑے بہت طبع زاد انشائیہ نما خاکے لکھے جو انگریزی اور اُردو اخبارات میں چھپتے رہے یا کچھ ریڈیو سے نشر ہوتے رہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں اپنے شائع شدہ ادبی سرمایہ کے اخبارات و جرائد کے قلمی نسخے محفوظ نہ رکھ سکا۔ اس مدت کے دوران کسی بھی ادب نواز دوست یا خیر خواہ نے مجھے تحریری مواد محفوظ رکھنے کی خاطر طباعت و

اشاعت کی طرف رجوع کرنے کی صلاح نہیں دی حالانکہ چند ایسے دوست خود تو بیسوں کتابوں کے مصنف و مولف ہو گئے لیکن خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے بارے چپ سادھنے سے ان کا کیا بھلا ہوا۔ خدا کا شکر کہ ادبی مشاغل کے ساتھ دل میں لگن لگنے کو سال ۲۰۱۸ء میں زوردار تحریک ملی جس کے نتیجے میں راقم نے طباعت واشاعت کی طرف رجوع کرنے کا عزم صمیم کیا۔ میرے پاس خالق کائینات کی نعمتوں پر اظہار تشکر کرنے کے لئے وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آج تک تین مطبوعات منظر عام پر لانے کی خوش نصیبی عطا فرمانے کے لئے خداوند قدوس کی احسان مندی کا حق ادا کروں۔ راقم کی چوتھی کتاب ''گوہرِ سُفتہ'' جو چھبیس طبع زاد انشائیوں کا مجموعہ ہے، عنقریب ہی منصہ شہود پر آنے کی اُمید ہے۔ انشاءاللہ

تاہم یہ بات اپنے قارئین کو گوش گزار کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ راقم نے انشائیہ نگاری کا وفا شعار بننے کے لئے ایک حقیر کوشش کی ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ ادب کی کسوٹی پر چڑھانے سے قارئین کے کیا تاثرات ہوں گے۔

راقم ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ جنہوں نے میری ادبی دوڑ دھوپ بالخصوص تحاریر کو کتابی شکل دینے پر نہ صرف اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے۔ راقم کو سال ۲۰۱۸ء کے دوران ایک مقامی ابھرتے نوجوان ادیب اور شاعر ڈاکٹر گلزار احمد وانی سے ملنے کا اِتفاق ہوا جنہوں نے میرے ہی سوچھ کرال میموریل کالج آف ایجوکیشن نیوہ میں اِنگو

پروگرام کے تحت ایک ٹیچر ٹرینی کی حیثیت سے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا ہے، ان کی ادبی خدمات کا محیط ان کی عمر سے بڑا ہے کیونکہ ان کی لگ بھگ پندرہ مطبوعات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ راقم نے ان کی صلاح پر ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف ''انشائیہ کے خدوخال'' دہلی سے منگائی اور اس کا مطالعہ کرنے سے خاطر خواہ طور آگاہی پائی جس کے لئے راقم ان کا بے حد شکر گزار ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں ڈاکٹر محمد اشرف صاحب گورکھپوری کا میرے کتابی مسودے پر اپنے زرین اور قدردانی کے کلمات رقم کرنے پر بے حد ممنون ومشکور ہوں۔ ان کے تاثرات سے میری اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ جو اگر کسی کو ہنہ مشق ادیب کی ہوتی تو وہ فخریہ انداز میں اپنے تشکُر کے ساتھ ''قدرِ جوہر بداند جوہری'' بھی کہتا۔

علاوہ ازیں اپنے نورِ چشم شارق ایاز علی کو دہلی سے اپنے تعلیمی کیریر کے دوران انشائیہ کے موضوع پر کتابیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لانے کے لئے شاباشی دینا اور شکریہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

آخر پر میں اس مسّودے کے راقم الحروف میر پرویز صاحب ترالی کا ان کی عمدہ، صاف اور صحیح کمپیوٹر کتابت بہ احسن وخوبی انجام دینے پر تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

غلام حسن طالبؔ

نیوہ (پلوامہ) جنوبی کشمیر

فون نمبر: 9149846599

''گوہرِ سُفتہ'' کے گوہر پارے

ڈاکٹر گلزار احمد وانی

''گوہرِ سُفتہ'' غلام حسن طالبؔ کا پہلا مجموعۂ انشائیہ ہے۔گویا یہ آپ کے لیے خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے آپ کا تخلیقی سفر بیسویں صدی کی سترھویں دہائی ہی سے شروع ہوا تھا،مگر اس طویل مدت تک ادب کے متنوع اصناف پر طبع آزمائی کر کے بھی ان سے کسی گوہر پارے کی شکل اختیار نہ ہوئی تھی ،مگر سال ۲۰۱۸ء سے جو تحرّک ان کے قلم میں آیا وہ بیان کرنے کے قابل ہے۔اس دوران آپ نے تین اہم کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔جو اس بات کا بھی عندیہ ہے کہ آپ میں وہ تمام قابلیتیں موجود ہیں جو ایک مکمل ادیب کے لئے ہونی چاہیئے۔اب جہاں تک ''گوہرِ سُفتہ'' کا تعلق ہے یہ ایک مجموعۂ انشائیہ ہے جس میں ۲۶ انشائیے موجود ہیں۔یہ انشائیے تجربات،مشاہدات،احساسات، معاشرت،ادب وثقافت،تاریخ،مزاح اور روایت وفلسفہ کے تمام پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ان انشائیوں کا مطالعہ ہر ایک قاری کو

مطالعے کی ترغیب فراہم کرتا ہے۔ ان کے پُشت پر وقت کا نادر خزینہ ہے، جس نے انشائیہ نگار کو ان موضوعات کی طرف لکھنے کے لیے مائل کیا ہے۔ اور اس کے متنوع پہلوؤں پر سوچ و چار کرنے پر اُکسایا ہے۔ ان تمام انشائیوں میں ایک ایک لفظ حرف بہ حرف پہلے تو دسترس فن پر دلالت کرتا ہے۔ اور دوم یہ کہ ہر ایک صورت حال کا نقشہ اور چہرہ مہرہ اسطرح پیش کیا ہے کہ جیسے ہر ایک یہ کہنے پہ آتا ہے ''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''۔ ایک عنوان کو کئی زاویوں سے پہلے سوچنا، اس پر خاکہ کھینچنا اور پھر اُسے لفظی پیرہن عطا کرنا اور اظہار کی راہ دینا اور پھر جملوں کی بناوٹ میں بندش الفاظ اور کہیں کہیں پر مسجع و مقفیٰ عبارت میں پیش کرنا کارِ دارد والا معاملہ اور دشوار ترین سفر ہے جیسے:

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ان انشائیوں کے مطالعے سے ایک باذوق انشائیہ کے قاری کو جیسے کئی صدیوں کی راہ سے زمانے کی رنگارنگی سے موسم کی نت نئی تبدیلیوں سے، رہ گزر کی تلخیوں سے، ظلماتِ شب کی نیرنگیوں سے، اپنے آپ سے الجھتی ہوئی نبرد آزمائی سے بالکل اپنے آپ کی بازیابی ہوتی ہے۔ یہ انشائیے جہاں تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں وہیں مزاح کی چاشنی اور طنز و مزاح

کے تیر بھی زمانے کی پیدا کردہ بندشوں پر ساد تے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غلام حسن طالب کے انشائیوں کی خاص بات ان کے اختصار میں جلوہ گر ہے۔ ان کے یہاں ہر ایک شئے اپنی بھر پور اظہاریت کے ساتھ بیان ہو جاتی ہے جس کا عام زندگی میں ٹھوس شکل وصورت کی بناء پر انہیں ایک قاری محسوس تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس پر مختلف النوع صورتوں میں جائزہ لینے کی بصارت حاصل ہو جاتی ہے۔ انکی انشائیائی شعریات میں ایک قاری جہاں دم قدم پر تخلیقی کارفرمائیوں کے ساتھ وہ سفر طے کر پاتا ہے جو وہ بظاہر کھلی آنکھوں سے دیکھنے سے قاصر ہے۔ یہاں انشائیہ نگار ہماری قوت تمیز پر ٹھوکریں ایسی لگاتا ہے کہ جو تازیانوں کا کام دیتی ہیں اور جن کی ملائم اور نرم چوٹیں قاری سہہ کر چوکنا ہو جاتا ہے کہ جیسے محمد حسین مذکورہ بالا اقتباس میں رقمطراز ہیں:

''انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے'' یہ آزاد و خوش گوار لفظ ''ترنگ'' انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ روح جس میں جولانی ہے مگر گرمی نہیں۔ جس میں انتشار ہے مگر پراگندگی نہیں۔ وہ روح جو دماغ سے زیادہ دل کو چھیڑتی ہے انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی، یہ ذاتی ہوتی ہے اس میں آپ بیتی اور پرانی بیتی دونوں کا لطف ہوتا ہے۔

یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جسکی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے ہم اسے ادب کی ایک پھلجڑی بھی کہہ سکتے ہیں"۔

اُردو و نثر کا فنی ارتقاء ص ۲۲۳ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سن اشاعت ۲۰۱۳

غلام حسن طالب کے انشائیے کہیں کہیں ذہن کی لہروں کی استدلالی صورت حال کو اکثر منعکس کرتے ہیں۔ جہاں ایک قاری ان لہروں میں بہہ کر کہیں خود کو گمشدہ پاتا ہے۔ اس طرح کی سنجیدگی اُسے آ گھیرتی ہے۔ جس سے استدراک کا عمل دخل نمایاں ہو جاتا ہے۔ جس کی مثال ان کے کئی انشائیوں میں مل جاتی ہے۔ سایہ، ریٹائرمنٹ، نمک وغیرہ انشائیے خاص طور پر اس ذیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

"پرانے زمانے کی لوک کہانیوں میں سایہ بال ہما پڑ جانے کے قصے آج بھی سننے پڑتے ہیں۔ ہما دراصل مشہور منگھیالی پرندہ ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ جس کے سر پر اس کا سایہ پڑے، وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ بہرحال جسم کے سایہ کا مثبت اور منفی دونوں نوعیت کے پہلو ہوتے ہیں جنہیں مشابہ یا منسوب کرنے سے معنی خیز اصطلاحوں کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے"

انشائیہ۔"سایہ"

آپ کی انشائیہ نگاری کے موضوعات میں تنوع جا بجا دیکھنے کو مل جاتا ہے۔آپ نے روزمرہ استعمال شُدہ اشیاء کو بخوب موضوعات کی ذیل میں لایا ہے اور کامیابی سے اس کے سرتادھڑ کو اظہاریت کی قبا پہنائی جس کے بعد ایک قاری محسوساتی طور پر ہی نہیں بلکہ ٹھوس اور مثبت پیکروں میں آپ کے انشائیوں کی شعریات سے بخوبی استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔یوں آپ ان انشائیوں میں انسان کے عادات و معمولات سے باہر بھی اس کے خصائل تک ایک قاری کو پہنچا سکتا ہے جس میں اس غنودگی کو کافور کر کے ایسے متجسس نظروں سے چہار سمت اُکسا کر ہمکنار کر دیتا ہے۔طالبؔ کے انشائیے زندگی کے نہ جانے کتنے پرت نمودار کر کے خود بخود بیاں ہو پاتے ہیں اور مسائل زیست تک ان کی ظاہر بینی کو دیکھا جاسکتا ہے۔یہاں انشائیہ نگار کا منفرد اسلوب پنہاں دکھائی دیتا ہے۔اس میں وہ تمام مظاہر کے مخفی مفاہیم کے احاطے کو گرفت میں لا کر انسانی شعور کو اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود بخشنے کے لئے اہم نکات کو بیان کرتے ہیں۔جیسا کہ وزیر آغا ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

''۔۔۔آخری نکتہ یہ ہے کہ انشائیہ نگار ایک ایسے جہان معنی کا نظارہ کرے یا اس کا شعور اپنے مدار کو توڑ کر ایک نیا مدار قائم کرنے میں کامیاب ہو۔اس بات کو آپ شعور کی توسیع یا Extension of

Conciousness کا نام بھی دے سکتے ہیں"

انشائیہ کے خدوخال، وزیر آغا، مکتبہ جامع لمیٹڈ نئی دہلی، اشاعت ۲۰۱۲ء

غلام حسن طالبؔ کے انشائیے غیر رسمی طریقۂ کار کو اپنائے ہوئے ایک ادب کے قاری کو شگفتہ مزاجی کی آڑ میں روح کے کسی گوشے سے نقاب کشائی کر کے اس کے اصلی حقائق سے اختصاراً وہ سب کچھ اظہار کرا لیتے ہیں کہ جس کی پشت پر تجربات، ذاتی ردعمل، اور شخصی واردات کارفرما ہیں پیش ہے ان کے انشائیے "مجبوری" سے ایک تراشہ جس سے کافی حد تک ان کے شعور کی توسیع کی تفہیم بھی ہوتی ہے اور ان کے منفرد اسلوب کی بھی۔

"بنی آدم کا کسی معاملہ پر اپنا پورا اختیار یا ادا کرنے کی سکت کھو دینے کا نام مجبوری ہے۔ مجبوریاں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو فطری ہوتی ہیں۔ اس قبیل میں مفلوک الحال لوگ شامل ہیں جنہیں زمانے کا ورق الٹ جانے سے بی پی ایل کیٹگری میں روٹی، کپڑا اور مکان کی مجبوریاں رفع ہونے میں مدد ملتی ہے"

اگرچہ انشائیہ کی تکنیک میں عدمِ تکمیلیت کا عنصر از حد موجود ہونا چاہیئے جس کے لیے ایک انشائیہ نگار کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے وہیں ان کے یہاں چند الفاظ انشائیے کی آخری عبارت میں استعمال ہو کر اس کے

خاتمے کا اعلان کر رہے ہیں جو تکمیلیت کے عنصر کو نمایاں کرتے ہیں جس کی جانب محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں انشائیہ نگار جب کسی بھی موضوع کے ساتھ بحث کرتے ہیں تو اس میں شخصی انشائیے کا شبہ ہو ہی جاتا ہے۔ اس میں کسی بھی عبارت پر سنجیدگی کی مہر ثبت نہیں ہوئی ہوتی ہے کہ اسے سنجیدہ پن کہیں بلکہ ان میں کہیں کہیں اپنے معاشرے پر طنز کے تیر بھی کسے ہوئے دکھائی دیں گے، اور مزاح کے خوشگوار پھوار بھی، جس کے تاثر سے ان کا اسلوب متوازن اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے کچھ انشائیے شخصی بھی کہلائے جاسکتے ہیں کیونکہ ان میں بہت دور اور دیر تک ایسے مرقعے دیکھنے کو مِل جاتے ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی اور نام دینا بھی درست نہیں ہے۔ شخصی عنصر کسی بھی انشائیے میں ہونا اچھی بات ہے جس پر ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے ہمنوا عصمت اللہ نے بھی بہت زور دیا ہے اور اسی لیے بعض مغربی مفکروں نے انشائیے کو لِرک سے مشابہ قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شخصی انشائیہ کسے کہیں، جس کے بارے میں نظیر صدیقی یوں رقمطراز ہیں:

"۔۔۔میرے خیال میں انشائیے کا شخصی ہونا ایک اور معنی بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ ضروری نہیں کہ انشائیے میں جو باتیں کہی جائیں ان کا لکھنے والے کی شخصیت سے تعلق ہو۔ بلکہ غیر شخصی باتوں کو

شخصی انداز میں بیان کرنا بھی انشائیے کو شخصی بنا دیتا ہے“

اُردو نثر کا تاریخی ارتقاء، ص: ۲۳، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

غلام حسن طالبؔ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ آپ کسی بھی موضوع کو اسی طرح تحرک عطا کرتے ہیں جس طرح کسی بند کمرے میں جمی ہوئی ہوا کو ایک پنکھا تحرک عطا کر کے اسے انسانوں کے لیے حیات بخش بنا دیتا ہے۔ عین اُسی کے، یہاں بھی انشائیہ نگار جمود کے لبادے میں بندھے ہوئے موضوع کو تحرک بخش کر اُسے پھر اُسی طرح گھماتا پھرتا ہے جس طرح ایک عورت چاول کو صاف کرنے کی خاطر اُسے چھاج میں گھماتی پھرتی ہے تب جا کر وہ لائق استعمال بن جاتا ہے۔ طالبؔ کے انشائیوں کی عبارت میں لفظوں کا زائد حجم قبا پہنے ہوئے نہیں ہے جس سے عبارت میں توازن برقرار رہ کر بے تکلف اور بامعنی صورت حال جنم لیتی ہے جو ذہن کی اطرافی جدّت سے معمور دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ بات بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ ان انشائیوں میں کہیں کہیں پر کسی عنصر کا ایک سِرہ ہاتھ آجاتا ہے تو وہیں دوسرے عنصر کا سرہ انگلیوں میں سے پھسل کر نکل جاتا ہے۔

”نمک اور شکر کی صورت حال آج جس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے اس سے لگتا ہے کہ معالجین اور اطباء ان دشمن جاں اشیاء کو بہشت کے پھلدار درخت کی طرح شجرِ ممنوعہ قرار دینے کے لئے تیار بیٹھے

ہیں ۔میرے لیے اس کے لیے کوئی آسان ترکیب نکالنے کی ضرورت ہے ورنہ نمک اور شکر کے اجزاء کا بالواسطہ طور پر غیر معروف چیزوں اور انسانی جسم میں موجود ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں‘‘

انشائیہ ’’نمک اور شکر‘‘

ان انشائیوں میں کہیں سنجیدگی میں غیر سنجیدگی اور کہیں پر غیر سنجیدگی میں سنجیدگی نظر آتی ہے ۔آپ کی عبارت کسی مخصوص معاشرے کے کسی زمرے کو نشان زد نہیں کرتی ہے بلکہ کلی طور پر یہ انسانوں کے خصائل، آداب واطوار، عادات، پسند ناپسند، زیرک مزاجی، بزدلی، رنجش، زود حسی، حزن وملال دکھائی دے رہا ہے تو کہیں قدروں کی شکست و ریخت، بدمزاجی، زوال آماد معاشرے کی بدحالی، بے کسی، بے بسی، رنج وغم، تکلف و تصنع اور بناوٹ بھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہے ۔اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں یہ انشائیے تاریخ کے اوراق پلٹتے پلٹتے قدروں کی شکست وریخت اور پائمالی کی داستان ہیں تو وہیں یہ عبارات انسانی وجود کے متفرق خصائل کی آگہی بھی فراہم کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں ایک قاری تخلیق کار کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک لمبا سفر طے کر پا رہا ہے جس میں کہیں پر سچائیوں کے ساتھ نبرد آزمائی ہے تو کہیں پر سچائیوں کے ساتھ پستیاں بھی زیر نظر رہتی ہیں ۔ان کے ذریعے

سے انشائیوں کے یہ خدوخال سماج و معاشرے کے کئی منظر نامے بیک وقت نظروں کے سامنے پھرتے ہیں۔

"انسانی فطرت کہیں یا کچھ اور، لوگوں کو ایک ریٹائرڈ ہوئے ملازم کی شخصیت اس کھنڈر کی مانند نظر آتی ہے جو کبھی ایک عالیشان عمارت تھی"

انشائیہ: ریٹائرمنٹ

غلام حسن طالبؔ کی انشائیہ نگاری کو دیکھ کر اب یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جموں و کشمیر میں صنفِ انشائیہ کی جڑیں مر مر کر زندہ ہوئی ہیں۔ یہی حال مغرب میں کئی دفعہ اعلان ہو کر بھی کئی ایسے نگاروں نے اسے ازسرِنو پہلے سے زیادہ قوت اور تحرک عطا کیا ہے۔ اسی طرح سے یہ اعلان کہ صنف انشائیہ آخری مرحلے کے آخری پڑاؤ پر ہے بالکل غلط اور بے جا ہے، کیونکہ یہ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی تازہ دم ہے، اور نہ جانے کیوں کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں۔ بقول وزیر آغا "کہ اب اردو والے اس مردہ کو کیوں کر زندہ کریں، یہ اعتراض تو اوّل اوّل شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا تھا"

انشائیہ کے خدوخال۔ وزیر آغا۔ ص: ۴۷، اشاعت ۲۰۱۲ء، مکتبہ جامع لمیٹڈ نئی دہلی۔

ابھی انشائیہ کو وہ جائز مقام نہیں ملا ہے جس کی یہ صنف حقدار ہے۔ ابھی

اس میں باولا پن ہے، روانی ہے اور ٹھہراؤ دیکھنا ہے کہ کہاں پر کرسکتی ہے مگر بڑے طمطراق انداز میں آگے آگے بڑھ کر اپنا سفر طے کر رہی ہے۔

میں غلام حسن طالب کو اس مجموعے کے منظر عام پر لانے کے لیے صمیم قلب سے مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ ہر ادبی حلقے میں انہیں مناسب پزیرائی حاصل ہوگی جس کے یہ حق دار ہیں۔

ڈاکٹر گلزار احمد وانی

ٹینگہ پونہ پلوامہ

۲۲/جولائی ۲۰۲۴ء

حرفِ چند

ڈاکٹر محمد اشرف

انشائیہ نثری ادب کا ایک خاص طرز اسلوب ہے۔ بالفاظ دیگر انشائیہ ایک ہلکا پھلکا اور شگفتہ مضمون ہے۔ جس میں انشائیہ نگار کی شخصیت و سیرت کی جلوہ نمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بعض اوقات انشائیہ فکاہی رنگ میں ڈوبے ہوئے بھی ارباب علم و ادب کی تفریح و نفس طبع کا سامان مہیا کرتا ہے لیکن کسی مضمون کا فکاہی ہونا ہی اس کے انشائیہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی ادبی نگارشات میں مزاح نگاری اور تعریف و توصیف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور صنفی حیثیت برائے نام ہوتی ہے۔ ایسے میں صنف انشائیہ کی روح اور اس کے اجزائے ترکیبی کے تقاضوں کو کاری ضرب پہنچتی ہے۔

انشائیہ دراصل ادب لطیف اور رومانیت میں ڈوبی ہوئی طرز تحریر ہے۔ وہ حیات انسانی کے پیچ و خم اور اس کے بنیادی مسائل و مصائب کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، جبکہ مضامین میں علم و آگہی کو دخل ہوتا ہے اور انشائیہ میں محض تاثراتی پہلوؤں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مضمون نگار

اپنے فہم و اِدراک اور شائنت و سنجیدگی کے حوالے سے ایک مخلص راہبر ثابت ہوسکتا ہے۔اس کے علی الرغم انشائیہ نگار اپنی یادگوئی اور آشفتہ بیانی کے ساتھ ایک اچھے غم خوار و دمساز انسان کے روپ میں بھی ہمارے سامنے جلوہ افروز ہوتا ہے۔مضامین میں فکر وخیال کی آمیزش موجود ہوتی ہے اور انشائیہ میں خواب وخیال اور احساس وعرفان کالازم ہونا ناگزیر ہے۔انشائیہ نگار موضوع سے متعلق اپنے گہرے تجربات وذاتی تاثرات نیز زمان ومکان کو اپنے تخلیقی فن پارے میں مجموعی طور پر ابھارنے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے،گویا انشائیہ اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ایک اہم صنف کی صورت میں ادب میں جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔

یوں تو یورپ کے ماہر لسانیات اور مایہ ناز ادیب مونؔ تینؔ نے انشائیہ مضمون اور مقالہ کی ابتدا ۱۵۸۰ء میں کی۔بعد ازیں یورپی ممالک کے علاوہ دیگر مغربی ممالک میں مونؔ تینؔ کی اس اختراعی کاوش کو تختۂ مشق بنایا اور کشاں کشاں ہندوستان میں نثری ادب کی اس نوزائیدہ صنؔف نے اپنا قدم اُتنا ہی مضبوطی سے جمایا جس کے اولین نقوش ملاوجہی کی کتاب ''سب رس'' اور خطوط غالبؔ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔رفتہ رفتہ ادب اردو کے بعض مایہ ناز ادیبوں میں محمد حسین آزاد کی تحریروں، ماسٹر رامچندر اور ان کے رفقاء وشاگرداں کے مضامین جو اس وقت دہلی کالج میں دوران

ملازمت لکھے گئے ان میں بھی انشائیہ نگاری کے دلکش نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔علاوہ ازیں سر سید اوران کے رفقاء شبلی ،حالی ،اور مولوی ذکااللہ وغیرہ جیسے منجھے ہوئے قلم کاروں کی تحریروں میں بھی انشائیہ کارنگ جھلکتا ہے۔

انشائیہ نگاری کا یہ سلسلہ تغیرات زمانہ کے تحت عہد بہ عہد جاری رہا اور آج بھی انشائیہ نگاروں کی دنیائے ادب میں قابل لحاظ تعداد موجود ہے۔انشائیہ نگاری کے اس لامتناہی سلسلے میں ہمارے فکشن نگاروں،اخبارات ورسائل کے مدیران نے بھی اس میدان میں طبع رسا کے جوہر دکھائے اوراس طرح ایسے انشائیہ نگاروں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی گئی۔ملک کے طول و عرض میں خصوصاً خطۂ جموں وکشمیر کے فنکاروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔یہ وہ خطہ ہے جہاں زبان اردو برسوں سے اپنا سکہ جمائے ہوئے تھی اور فی زمانہ یہاں شعروشاعری کے ماسوا نثری ادب پر بھی خاصا کام ہورہا ہے، بالخصوص فکشن نگاری، ڈرامانگاری کے علاوہ انشائیہ نگاری پر کئی کتابیں منصۂ شہود پرآچکی ہیں۔محمدزمان آزردہ پروفیسر منصوراحمد منصور، برج پریمی اور گلزاراحمد وانی جیسے فنکار صنفِ انشائیہ کے گیسوؤں کو سنوارنے میں مصروف عمل ہیں۔ان جہاندیدہ وچشیدہ فنکاروں کی صف میں بزرگ قلم کار غلام حسن طالب کانام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔غلام حسن طالب محتاج تعارف نہیں۔آپ میدان ادب میں ایک انفرادی شخصیت کے مالک

ہیں ۔ادبی فتوحات کے علاوہ آپ روزناموں میں کالم نگاری کی حیثیت سے امتیازی مقام رکھتے ہیں ۔انہوں نے اردو اور کشمیری زبان میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے ہیں ۔ترجمہ نگاری، تاریخ ،تحقیق وتنقید، مزاح نگاری ،تذکرہ نگاری اور انشائیہ نگاری وغیرہ اہم کارہائے نمایاں ہیں"

خوشی کی بات ہے کہ غلام حسن طالبؔ کی چوتھی کتاب یعنی انشائیوں کا مجموعہ "گوہر سُفتہ" (گلدستہ انشائیہ) جس میں ۲۶ انشائیے ماہ وانجم کی مانند درخشاں ہیں ۔ان انشائیوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ طالبؔ صاحب نے اُردو ادب میں مرقوم بے شمار انشائیوں کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد نہایت کاوش سے انشائیہ نگاری کے فنی لوازم اور امتیازی خصوصیات کا بہت قریب سے جائزہ لیا ہے اور جس موضوع ومسائل پر خامہ فرسائی کی ہے اس کے خال وخط کو اپنے انشائیہ میں واضح شکل میں پیش کیا ہے ۔طالبؔ صاحب نے فن انشائیہ نگاری کو اپنی فکری کاوشوں سے لازوال بنانے میں بڑی عرق ریزی وجانفشانی سے کام لیا ہے اور ایسے چند موضوعات پر مبنی انشائیے رقم کئے ہیں جو نہ صرف اپنے معاصرین کی صنف میں جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں، بلکہ وہ خطہ جموں وکشمیر کے نمایاں انشائیہ نگاروں میں بھی شمار کئے جاتے ہیں ۔

زیرِ نظر کتاب اپنے موضوع پر ایک جامع تصنیف ہے ۔طالبؔ صاحب

کی یہ تصنیف انشائیہ نگاری کے میدان میں ان کا پہلا کارنامہ ہے جو نقش اول کی حیثیت سے قابل ستائش ہے۔ یہ کتاب ان کے ادبی قد و قامت کو سربلندی عطا کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ طالبؔ صاحب نے بڑی محنت اور یکسوئی کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے، ہر ایک انشائیہ کے الفاظ جملوں کی تراش خراش اور نوک پلک کی درستی، شیرینی ولطافت دیدنی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ غلام حسن طالبؔ لکھنے کا سلسلہ لگن اور جانفشانی کے ساتھ جاری رکھیں گے اور دنیائے ادب کو متعدد ایسی تخلیقات وتصنیفات عطا کریں گے جو ان کی شہرتِ دوام کی ضامن ہوں گی۔

ڈاکٹر محمد اشرف

گورکھپور (یوپی) ۳۱؍ جولائی ۲۰۲۴ء

کرسی

نسوانی نزاکت والے نام سے مشابہ بے جان کرسی جو ایک زمانے میں صندلی کے نام سے چرچا میں تھی، نے عالم اسباب میں ہر دل عزیز ہونے کا اعزاز پانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ وہ کونسا دربار یا ایوان یا ادارہ ہوگا جہاں کرسی نے اپنے لئے پہلے ہی جگہ نہیں بنائی ہو۔ سرکاری اور نجی دونوں سطحوں پر اشرف المخلوقات کی عزت و توقیر کو چار چاند لگانے میں اس کا ایک بڑا کردار رہا ہے۔ دراصل اس کے عالی رتبہ ہونے میں حکمت الٰہی کی وہ کرشمہ سازی کارفرما ہے جس کے تحت عرش سے فرش تک اپنا جاہ و جلال قائم کرنے کے لئے پروردگار عالم نے عرش اعظم اور کرسی کی تخلیق آناً فاناً کر کے رکھ دی، جنہیں فرشتگاں سہارا دینے پر مامور ہیں۔ خالق کائنات نے لوح و قلم، عرش و کرسی اور ارض و سماوات وغیرہ معرض وجود میں لانے کے ساتھ ساتھ بنی آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنائی کرسی کے ساتھ میز یا ٹی پائے کا بالمشافہ ہونے کے شرف نیاز سے نوازا ہے۔ کرسی کی معانی میں جہاں چوکی، تخت، مسند، گدی اور سنگھاسن جیسی طرح طرح کی نشستیں بیان ہوئی

ہیں وہاں چندن کا مُعرّب صندلی کی دو رنگی (سرخ وسفید) خوشبودار لکڑی سے بنائی گئی کرسی کو کچھ مدت تک صندلی سے موسوم کیا گیا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ ہم فرشِ خاک پر پیدا ہوئے انسان، چاہیئے دِکھاوا کے لئے ہی سہی، کتنا ہی فرش فروش کریں، کرسی یا سوفے پر بیٹھنے اور بیڈ یا پلنگ پر سونے کا ایک الگ ہی مزہ ہے۔امیروں نے اپنی نام نہاد بلند پایگی قائم و دائم رکھنے کے لئے کرسی کی آرام رساں سیٹ سوفہ کو اپنے محلوں کی زینت بنانے کو ترجیح دے رکھی ہے۔جہاں ہم سب کو سوفہ کی نرم ملائم سیٹ اور حد سے زیادہ پست قد ہونے کی واقفیت ہے وہیں ہمیں اس کے بھاری پن کا بھی بخوبی احساس ہے۔اگر ہم غور کریں تو کرسی اور سوفہ کے بارے میں یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ گویا پرانے ماڈل کے مقابلے میں جدید ماڈل کی آرام رساں کرسی مارکیٹ میں لانچ ہو گئی ہے۔مگر دیگر کیفیات کے سبب صوفے کا ہی پلڑا بھاری رہتا ہے۔وہ اس لیے کہ ایک سوفہ آسانی سے اٹھایا نہیں جا سکتا جبکہ ایک کرسی کو کندھے یا سر پر اٹھانے سے محنت بھی کرنا پڑتی ہے اور راحت بھی نصیب ہوتی ہے۔

یوں تو کئی قسم کی کرسیاں بازاروں میں دیکھی جا سکتی ہیں لیکن جب سے پلاسٹک سے بنائی گئی رنگا رنگ کرسیاں مارکیٹ میں پانیوں کی طرح ٹھاٹھیں مارنے لگی ہیں، لکڑی کی کرسیوں کے معاشرے کا رنگ دِگرگوں

ہو گیا ہے۔ جہاں لکڑی کا کچرا راکھ ہو جاتا ہے وہیں پلاسٹک کرسیوں کے کچرے زائل ہو کر بھی لافانی بن جاتے ہیں۔

ہم بھی زمانہ دیکھے بیٹھے ہیں، جب کسی غریب انسان پر امیری کا بھوت سوار ہو جاتا ہے وہ پھر خواب دیکھنے لگتا ہے۔ آناً فاناً اپنے گھر کے آنگن میں ایک چھوٹا سا پارک بنانے کی سوچتا ہے اور اس میں ایک دو کرسیاں رکھنے سے دل کی آگ بجھاتا ہے۔ الغرض اِس کرسی کا عمل دخل سرکاری اداروں وغیرہ کے ساتھ ساتھ نجی اداروں وغیرہ میں بھی بڑھنے لگا ہے۔ کسی بھی ہیر کٹنگ سیلون پر خاص انواع کی آرام رساں کرسیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ڈینٹل کلینکوں پر بھی آرام دہ کرسیاں ہوتی ہیں تاکہ بیماروں کا علاج آسانی سے ہو اور درد آگیں دانت نکالتے وقت ایک مریض کو نفسیاتی طور بھی سہولیتیں میسر رہیں تو گویا اس قسم کی کرسی اخراجِ دانت کرنے کے دوران شادیوں کی تقریبات کے دوران دلہا دلہن کو مہندی لگانے کی رسم کرسی پر انجام دینے کے علاوہ میک اَپ کرنے، مہمانوں کی مجالس میں دلہا کو بٹھانے اور برات آنے کے موقعے پر دلہا کی بھرپور آؤ بھگت کرنے کے لیے بھی کرسیاں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ تعلیمی اداروں اور تمام قسم کے سرکاری نیم سرکاری اور نجی اداروں میں کام کرنے والے انسانوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں ایک زمانے سے مُروج ہیں۔ دراصل یہ کرسی انگریزوں کی

دین ہے کیونکہ وائٹ کالر بابوؤں کے لئے کرسی ایک مناسب بیٹھک قرار پائی ہے۔مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض ٹے پتلون پہنے ہوئے سرکاری افسروں کا دماغ فرش پر لگی کرسیوں پر بیٹھ کر عرش پر ہوتا ہے۔وہ اس لئے کہ وہ اقتدار کے نشے میں ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔انگریزی کا ایک مقولہ ہے ''چیئر شوز دی مین''، جس کا مطلب ہے کہ ایک انسان کی پہچان کرسی سے ہوتی ہے۔اس تناظر میں سرکاری و نیم سرکاری سربراہان کی کرسیاں اکثر زیر بحث آتی رہتی ہیں۔پرانے زمانے میں بادشاہت نے جانشینی کو عروج بخشا تھا۔ اب یہ زمانہ کہ لوگوں کے منتخبہ نمائندے ایک چنیدہ کو اعلیٰ اقتدار کا مالک بناتے ہیں اور وہ کرسی نشین ہو جاتا ہے۔مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب ایک وزیراعظم کی کرسی پر سالہا سال تک بیٹھنے والی شخصیت کو وزیر اعلیٰ کی چھوٹی کرسی میں ٹھُسنا پڑا تھا۔کرسی کے لئے رسہ کشی یا جنگ فی الحقیقت اقتدار حاصل کرنے کی لڑائی ہوتی ہے۔کبھی کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کرسی کو لات ماری ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ لاتیں اقتدار پر چلائی جاتی ہیں، کرسی پر نہیں کیونکہ یہ ہر وقت اس کی ہوتی ہے جو حسبِ ضابطہ اس کا جائز حق دار ہوتا ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی یہ کرسیاں بعض لالچی عہدے داروں کے لئے موروثی ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ جب کبھی کسی ملازم یا افسر کا کسی عہدے پر معیاد ملازمت سے قبل تبادلہ کیا جاتا ہے اور وہ عدالتِ عالیہ میں رِٹ دائر کرتا

ہے تو وہ اپنا مقدمہ لڑنے کے دوران اپنی موجودہ کرسی سے لپٹ جاتا ہے تاکہ اپنے بدلے آنے والے کو کرسی پر قابض ہونے کا چانس نہ مل سکے۔

ادبی، سماجی اور مذہبی تقریبات کے دوران سب سے پہلے ایوانِ صدارت یا پریزیڈیم کرسیوں، ٹیبلوں اور سوفوں سے سجائے جاتے ہیں۔ کسی بھی مجلس کی صدارتی کرسی معظم اور مقتدر شخصیت کے لئے مختص کی جاتی ہے۔ ویسے تو فارسی زبان کی ایک کہاوت بھی ہے "صدر ہر جا کہ بنشیند صدر است" گویا صدر جس کرسی پر بھی بیٹھتا ہے صدر ہی کہلاتا ہے۔

خاص مجالس یا دفاتر میں کسی بھی ذی عزت یا ذی اختیار شخصیت کو سب سے پہلے کرسی آفر کی جاتی ہے۔ دنیا میں حکمرانی یا اقتدار کے لئے جو جنگ و جدل چلتی رہتی ہے اس کو خواہ مخواہ کرسی اقتدار کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اب تو ہمارا یہ حال ہے کہ ایک بار جو سیاست دان کرسی نشین ہو جاتا ہے وہ ایک جنونی عاشق کی طرح اپنی محبوبہ یعنی کہ کرسی کی جدائی گوارا کرنے کی موڈ میں نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ سیاست دانوں کی مقدر میں ریٹائرمنٹ یا بڑھاپا لکھا ہی نہیں گیا ہو۔ جب جب بادشاہت کے دوروں میں کوئی انقلاب آیا تو تختہ الٹنے کی خبریں پھیلتی تھیں لیکن کرسی الٹنے کی خبر آج تک سُنی ہے نہ سنیں گے۔

انتظار

انتظار ایک ٹھہراؤ ہے جو بے قراری اور شتابی کے باوجود بے حس و حرکت رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ انتظار ذرائع ابلاغ کے مروجہ کمرشل بریک کی طرح ایک ایسا وقفہ ہے جو خود تو ساکت رہتا ہے پر اس کے دوران زندگی کی دوڑ جاری رہتی ہے۔ ایک تشنہ دل مُنتظر، چاہئیے، کتنے ہی انتظاروں کے نتائج دیکھنے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہو لیکن ان کے دوران وہ سہانے خواب دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ ہے کہ بنی نوع انسان اُمید و بیم کی زندگی گزارنے کے دوران اپنے آگے مقدر کے خوش آیند لمحات دیکھنے کی آس لگاتا ہے۔ اس نوعیت کے انداز فکر کو انتظار سے ہی موسوم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ لوگ اِس بات کو اکثر دہراتے ہیں کہ آگے کی خدا جانے، لیکن اندر خانے وہ لامحالہ اچھائی کے منتظر ہوتے ہیں، دراصل مثبت سوچ رکھنے والے افراد میں جو تڑپ اور بے صبری ہوتی ہے وہ اظہار میں بہت کم آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ وقت وقت پر دامن اُمید تھام لیتے ہیں۔ کہاوت ہے، زندگی زندہ دلی کا نام ہے، مُردہ دل کیا خاک جیا

کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے سفر میں کئی مرحلے یا پڑاؤ آتے ہیں جنہیں طے کرنا ہوتا ہے۔ اس پورے سفر کے دوران ایک انسان منزل بہ منزل، کے انتظاروں سے اُمیدوں کے سہارے گزرتا ہے۔ حالانکہ ان میں خوش بختی اور یاس وحسرت کی داستانیں بھی ہوتی ہیں۔ آدم زاد یا آدم زادی کو بچپن سے ہی لمبا سفر طے کرنے کے بعد جوانی کی دہلیز پر، زہے نصیب، قدم رنجہ ہونے کا انتظار اور اسی کے ساتھ بالغ یا بالغہ کو بیاہنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اسکے بعد دونوں کی جوانیاں ڈھل جاتے ہی پیرانہ سالی کی طرف چار وناچار شفٹ ہوجانے کا انتظار اور پھر بڑھاپے میں ہی آخری رختِ سفر باندھنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال ایک انسان کو دنیاوی زندگی کے سفر میں بے شمار انتظاروں سے نکلنا پڑتا ہے۔ کامیاب ہونے کی صورت میں وہ خوش نصیب کہلاتا ہے جبکہ نامرادی کی صورت میں وہ بدقسمت کہلاتا ہے۔ فطرت نے دن رات کے آب وہوا اور ماہ وسال کے موسموں کا تغیر وتبدل دھرتی پر رہنے والے تمام جانداروں کی بھلائی کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ ایسی تبدیلیاں وقوع میں آنے کے دوران لگتا ہے گویا الادین کے چراغ کے کمالات ہیں۔ جب سے موسمیاتی ماہرین کی پیش گوئیاں صحیح ثابت ہونے لگی ہیں لوگوں نے فلکِ شعبدہ باز کی طرف نظریں جمانا اور آنکھوں دیکھی پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا نے سائنسی علوم

پڑھنے والوں کو وہ طاقت عطا کی ہے جس کی بدولت لوگ ان کی موسم کے تغیر و تبدل سے متعلق خبروں پر اعتبار کرنے لگے ہیں۔اب یہ خبرنامے جن کا شہر و دیہات میں انتظار ہوتا رہتا ہے، اتنے قابل اعتبار تصور ہونے لگے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان پر غیبی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ان خبرناموں کی اعتباریت اور مقبولیت سے مانوس ہو کر لوگ اب شادی بیاہ کی تقریبوں وغیرہ کے لئے ایام خاص مقرر کرتے وقت موسم کی تازہ جانکاری لینے کا اِنتظار کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ زراعت اور باغبانی سے وابستہ لوگ بیج بونے، فصل کاٹنے، دوائیاں چھڑکنے اور کھاد ڈالنے جیسے موقعوں پر پہلے موسمی اطلاعات کے منتظر رہتے ہیں اسکے بعد ہی کام دھندے کے دِن مقرر کرتے ہیں۔

داناؤں کا قول ہے لالچ بُری بلا ہے۔مگر کیا کریں حرصا حرصی کا گراف بھی مُنشیات کی وباء کے گراف سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے۔لہٰذا ایک انسان کی دنیاوی تمنائیں جتنی کم ہوں گی، اتنے ہی حساب سے اس کے انتظاروں کا بوجھ ہلکا ہوگا۔کہتے ہیں سخن گوئی مشکل نہیں، سخن فہمی مشکل ہے۔شعر و سخن کی دنیا کے لوگوں کی کبھی کبھی خدا سے استفہامیہ انداز میں مخاطبت ہوتی ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ایک سخنور کے حساب وکتاب کے مطابق چار دن کی یہ زندگانی ہم نے مانگ کرلائی تھی۔اس میں دو دن آرزؤں میں اور پھر دو دن انتظار میں کٹ گئے۔باقی غیر ممکن الوصول۔۔۔!

ایک قول ہے ''عشق ومُشک چھپائے نہیں چھپتے'' عشق مجازی میں عاشق ومعشوق کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کا انتظار جس کی دردگیں بیقراریاں اب داستانِ پارینہ بن کررہ گئی ہیں۔فون کی آمد کیا ہوئی انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ایک سوچی سمجھی ویڈیو کال کے ملنے ملانے سے دوطرفہ دربار لگنے میں دیر نہیں لگتی۔عشق حقیقی کے موضوع پر میں کیا بات کروں،باریک بین ہوں نہیں!البتہ دریافت کرنے پر میرے ایک دوست نے مجھے کچھ دیرانتظار کرایا۔رات کوفون پر شاعرمشرق کے ایک مصرعہ ''کبھی اے حقیقت مُنتظر نظر آلباسِ مجاز میں'' کا حوالہ دیا۔

بہرحال وقت کسی کا بھی انتظار نہیں کرتا۔کہاوت بھی ہے کہ ہاتھ سے گیا ہواوقت اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔علامہ اقبال جیسے عظیم شاعر کا زمانے کے کروٹ لینے کے بعد کسی گئے گزرے مجذوب کے حوالے سے لکھا یہ شعر مُخاطب کے لئے انتظار میں رہے گا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

فارسی کے ایک عظیم شاعر شیخ سعدی شیرازیؒ نے موضوع کے حوالے سے ایک پتے کی بات بیان کی ہے۔

''ایک انسان کی ساری عمر اچھے دنوں کے انتظار میں گزر جاتی ہے، بعد میں پتا چلتا ہے کہ جو دِن گزر گئے وہی اچھے تھے۔ ویسے بھی لوگ موجودہ زمانے میں پرانی شراب نئی بوتلوں میں بیچتے ہیں۔ اکثر ہم ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے ''انتظار کی گھڑیاں ختم'' ہونے کے ڈُبنگ اعلانات سماعت کرتے ہیں۔ بھلا ان ایجنسی یا کمپنی والوں سے کوئی پوچھے کہ لوگوں نے کب آپ کے نئے پروڈکٹ کی خبر سنی تھی یا مارکیٹ میں آنے کا انتظار کیا تھا؟ جو آپ کہتے ہیں کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔

ادھر سے انٹرنیٹ کے معرض وجود میں آنے سے انتظار کے دورانیے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعروں کے لیے انتظار کی زبردست اہمیت تھی لیکن انٹرنیٹ کی برق رفتاری نے اس کی بھی نفی کر دی ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ ایک انسان کی دنیاوی زندگی اُمیدوں کے ثمرات پانے کے انتظار میں گزر جاتی ہے اور وہ اس آخری لمبے انتظار کے بعد آنکھیں موند لیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی اُس کے دنیاوی انتظاروں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ فِکر اور انتظار کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ فکر لاحق ہونے سے انتظار جاری رہتا ہے۔ چاہیئے فکرِ دنیا ہو یا فکرِ آخرت۔

جان پہچان

کسی شخص یا شے کو جاننے کے لئے پوچھنا پاچھنا ہی کافی ہے لیکن پہچاننے کے لئے جاننے بوجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارسطو سے پوچھا گیا، عالم اور جاہل میں کیا فرق ہے؟ جواب دیا جاہل عالم کو نہیں جانتا، کیونکہ وہ کبھی عالم نہیں رہا لیکن عالم جاہل کو جانتا ہے کیونکہ وہ خود جاہل رہ چکا ہے"۔ میری سوچ میں یہ جان پہچان ایک نعمتِ ازلی ہے جو بنی آدم کے لئے پیدائشی ضرورت بن کر رہ گئی ہے۔ ایک نوزائد بچہ جب ماں کا دودھ پینا شروع کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اُسے اسکے رٹنے کی استعداد کے مطابق اپنے عزیز واقارب کے نام پکارنا سکھایا جاتا ہے۔ پتے کی بات تو یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے لے کر کوئی نہیں آتا۔ اگر دنیا میں جان پہچان کرنے کے عمل کا چلنا نہیں ہوتا تو ہر طرف سے گھومتے پھرتے انجانے ہی انجانے نظر آتے۔ شہر و دیہات میں قبرستانی خاموشی کا سماں بندھا ہوا ہوتا۔ ویسے بھی خدا نے خاص حکمت عملی کے تحت بنی آدم کے جسم کو اعضائے رئیسہ سے بہرہ مند کیا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ زبانِ شیریں مُلک

گیری، زبان ٹیڑھی ملک بانکا۔ میرے خیال میں ''جان پہچان'' کا لفظ ''تعارف'' کا نعم البدل ہے جو عالمی سطح پر ہر کس و ناکس کے لئے نافذ العمل ہے۔ جان اور پہچان لفظوں کا تقابلی جائزہ یوں لینے کی جسارت کرتا ہوں۔ جان سے مطلب کسی فرد یا چیز وغیرہ کو سرسری طور بادلِ ناخواستہ جان لینا ہوتا ہے جبکہ پہچان سے مراد حقیقتِ نفس الامری ہے۔ ایک شاعر نے موضوع کے حوالے سے اپنا مَن ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخر تمہارا ناز کشیدہ ہے مصحفیؔ
کیوں بن گئے ہو جان کے انجان یہ کہو

کسی کو ایک بار ملنے یا اس کا ایک دن کے لئے ہم سفر ہونے یا کسی محفل میں کسی غیر کے ساتھ گفتگو کرنے سے سرسری جانکاری ہو ہی جاتی ہے جو کبھی کبھار یاد بھی آتی رہتی ہے لیکن غرض کا باولا اپنی ہی گاوے چاہیے اُسے اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بھی بنانا پڑے۔ ایسے میں دوطرفہ جان پہچان بعض سرکاری فائلوں کی طرح داخل دفتر ہو جاتی ہے۔ البتہ جو جان پہچان رشتہ داری یا تجارتی شراکت یا دوستی یا کسی لمبے سفر پر جانے کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتی ہے وہ ہر لحاظ سے حقیقت کے قریب قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ ان اوقات کے دوران فریقین کو ایک دوسرے کے مزاجوں تک کی رسائی آسانی سے ہو جاتی ہے۔

یوں تو لگتا ہے کہ مرد شناس کا رتبہ ایک بھلے مانس، آدمی سے بھی بڑھ کر ہے مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مجھے مردوں کے اعزازی ناموں سے چڑ کیوں ہے۔ تاہم ایک وجہ صاف عیاں ہے کہ مردوں کے یک طرفہ فیصلے آدم زادیوں کو ناگوار گزرتے ہیں، اگر زن شناس کی اصطلاح مستعمل نہیں ہے تو پھر آدم زادے کس کی ایما پر مردِ آہن، مردِ حق، مردِ میدان، مردِ خدا اور مردِ بچہ جیسے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آدم زادیوں کے معاملے پر جو مختصر سی بات میرے غور وفکر کرنے والے دل و دماغ میں چل رہی ہے۔ وہ اس طرح ہے چونکہ حضرت حوا کی تخلیق حضرت آدم کی طرح الگ سے نہیں کی گئی ہے بلکہ مشیتِ ایزدی سے اس کی تخلیق حضرت آدم کی بائیں پسلی سے ہوئی ہے، لہٰذا وہ ایک زندہ انسان سے تخلیق کی گئی ہے اس لئے حوا نام رکھا گیا گویا آدم زادی خود بہ ذات نہیں ہے بلکہ مردِ حیات کا ایک جُز ہے۔

جان پہچان کو اس کے وسیع مفہوم کے تناظر میں دائرۃ المعارف یا مخزن العلوم کی علمیت حاصل کرنے اور پھر پرکھنے جانچنے کے بعد ذہن نشین ہونے کا آلہ کار قرار دینے میں شاید کوئی قباحت نہیں ہے۔

دنیا میں انسانوں کی جان پہچان بڑھانے کے لیے بیشمار سماجی، مذہبی، ادبی، ثقافتی، تعلیمی (سرکاری و نجی) ادارے" درس و تدریس کا کام

باقاعدگی سے انجام دیتے ہیں جس کے دوران متعلمین نئی پرانی جانکاریوں سے مستفید ہوتے ہیں۔اب خداہی بہتر جانتا ہے کہ معلمین خود کس حد تک دوسروں کو سمجھانے والے علوم کی جان پہچان رکھتے ہیں اور ان کی طرف سے ڈیلور کئے جارہے نظریات وغیرہ سمجھنے والوں کے لئے کتنے صحیح، کتنے غلط، کتنے مبہم اور کتنے متنازعہ ہوتے ہیں۔یہی حال مساجد، خانقاہوں، امام باڑھوں، مندروں اور گوردواروں کا ہے۔ذرائع ابلاغ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے، یہاں بھی کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان،سوشل میڈیا والے کہتے ہیں ہم بھی کسی سے کم نہیں۔البتہ فلمی دنیا کے جانے مانے ہرفن مولا فنکار امتیاب بچن جی اپنے پلیٹ فارم "کون بنے گا کروڑ پتی" پر کوئز ماسٹری کا لوہا منوا چکے ہیں۔چنانچہ بالمشافہ ہونے والے مہمانوں میں سے آٹے میں نمک کے برابر شرکاء جان پہچان کی کسوٹی پر کھرے اُترنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔چونکہ ہم ابتداء سے ہی بدیسی کاریگروں کے مال کے شائقین رہے ہیں لہٰذا سرکار سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ باہر کے اُستا کارلوگوں کی خدمات حاصل کرنا جان پہچان کو بڑھاوا دینے کے لئے اپنی اولین ترجیحات میں شامل کریں۔ادھر سے جان پہچان کے عمل میں بھی دھاندلیاں ہونے کی معتبرانہ اطلاعات ہیں۔خبر ملی ہے کہ بعض حضرات کی راہ روِش میں اس حد تک کھوٹ آئی ہے کہ وہ اکثر معاملات میں جان کر بھی

انجان بننے کا سوانگ رچاتے ہیں۔ یہ بھی اطلاع ہے کہ جن لوگوں کو معروف یا ذمہ دار شخصیات تک رسائی کرنے میں دشواری پیش آتی ہے وہ خواہ مخواہ کی دوستی جتانے سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے ”جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام“ والی مثل فِٹ آتی ہے، جب کسی جوان مرد کی نیت کسی غیر محرم عورت کو دیکھ کر ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہے تو وہ اس سے بالمشافہ از نظرِ التفات جان پہچان بنائے رکھنے کی چال چلتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جان پہچان ایک قد آور درخت کی مانند ہے جس کی خوبصورت شاخیں، ادھار کارڈ، الیکشن کارڈ، شناختی کارڈ، راشن کارڈ، پاسپورٹ وغیرہ کی صورت میں ہر کسی فرد پر سایہ افگن ہیں۔ موبائل فون کا کیا کہنے اِسے تو جیون ساتھی ثانی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ عیاں راچہ بیاں؟

کون کہتا ہے کہ جان پہچان کا عمل سہل الحصول ہے۔ ایک عربی قول کے تناظر میں کچھ اپنی بھی خبر لیں، مَنْ عَرَفَ نفسَہٗ فَقَد عرفہ ربہٗ۔۔۔ ”جس نے اپنے نفس کو پہچانا گویا اس نے خدا کو پہچانا“۔ نفس سے مراد ذات، وجود، حقیقت، لُب لباب، خواہشاتِ نفسانی، ہستی جیسے مترادف الفاظ ہیں۔ کیا آپ نے مشاہدہ نہیں کیا ہے کہ ہماری جان پہچان زیادہ تر ایک دوسرے کو سرسری طور جاننے تک محدود ہوتی ہے، پہچاننے کے لئے پہلے مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاقیاتِ زندگی کے اجزاء میں سے

نیت، ارادہ، مرضی، منصوبہ، منشا، خواہش، اچھائی وغیرہ بنی آدم کے داخلی اعمال ہیں۔ خدا کے بعد بندگانِ خدا ہی جانتے ہیں کہ ان کی اندر کی کہانیاں اور کارستانیاں کیا ہیں۔ کچھ کچھ تو طبیعتوں کی اعتدالیوں اور بے اعتدالیوں پر بھی منحصر ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کے ہوتے ہوئے باپ بیٹے، ماں بیٹی، بھائی بہن، بھائی بھائی، میاں بیوی کے درمیان خلیج پڑ جانا اور پھر ایک دوسرے سے مُتنفّر ہونا دراصل اسی جان پہچان کے ہوتے اُتاولی سے سوچنے کے باعث ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس دنیا سے بہت سارے لوگ ایک دوسرے کو پوری طرح جانے پہچانے بغیر رحمتِ حق ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ انسانوں کی بعد از مرگ جانے انجانے تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہمارے لوگوں کا صدیوں پرانا طرزِ عمل ہے۔ ایک انسان کے مزاج اور داخلی صورت حال جاننا پہچاننا کسی علمی مضمون پر ریسرچ کرنے سے کم نہیں ہے۔

ریٹائرمنٹ

ریٹائرمنٹ ایک انگریزی لفظ ہے جس سے خاص مراد ملازمت سے رخصتی یا سبکدوشی ہے۔ سرکار نے دستور العمل میں اپنی مروجہ تاناشاہی کو برقرار رکھنے کے لئے زبردستی سبکدوشی کی شرط کا اندراج پہلے ہی سے کر رکھا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بیزار ہو کر بعض حضرات خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں گویا یہ لوگ حسبِ مرضی دنیاوی دھندوں سے اسی طرح گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں جس طرح سرکار نے ملازمین کے لئے قانون میں حسب مرضی ریٹائرمنٹ لینے کی شرط عائد کر رکھی ہے۔ کبھی کبھی ہم یہ بھی سُنتے ہیں کہ فلانا لیڈر سیاست سے کنارہ کش ہوا ہے گویا یہ کنارہ کشی بھی ایک قسم کی ریٹائرمنٹ ہے، میرے خیال میں سیاست سے کنارہ کشی کرنے کا، خواہش مند کوئی عاجل ہی ہو سکتا ہے ورنہ ایک بار جس نے پری رخسار سیاست کی دیو داسی کو دیکھا اور پھر کچھ ساعتیں اس کے ساتھ بتا ہیں وہ کبھی بھی سبکدوش ہونے کی ذکر تک نہیں کرے گا۔ ویسے بھی جو لوگ دفعتہً سیاست میں قدم جماتے ہیں وہ کبھی بھی ریٹائرمنٹ لینے کا

اور دوسرے کے لئے خوش آمدید کے طور اپنے زرین خیالات والے خطابات دینے کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کبھی بھی ملازم کا ریٹائر ہونا ویسا ہی ہے جیسا کہ سورج کا ڈوبنا اور نئے افسر کی آمد سورج چڑھنے کی مانند ہوتی ہے۔ پوجا بھی چڑھتے سورج کی کی جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ریٹائرڈ یا تبدیل کئے گئے افسر کے بدلے نئے افسر کی آمد پر بعض محکموں کے ملازمین اُسے اپنے شیشے میں اُتارنے کے لئے تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں۔ اس قسم کی صورت حال میں کسی کا یہ کہنا سچ لگتا ہے کہ ''نئے جب یار ملتے ہیں تو پرانے بھول جاتے ہیں''۔ کبھی کبھی ریٹائرمنٹ کے موقعے پر ہونے والی پُر وقار تقریب منعقد ہونے کے سنہری خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ جاتے ہیں، وہ اس لئے کہ اگر متعلقہ سبکدوش ہونے والے افسر نے انتظامی امور چلاتے وقت ایماندارانہ رویہ اختیار کیا ہو جس سے اس کے اور اعلیٰ ترین حکام کے مابین کوئی اَن بن پیدا ہوگئی ہو تو جب اس کی ریٹائرمنٹ یا تبدیلی قریب ہوتی ہے تو پورے محکمے میں کسی قسم کی ایسی کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی جس سے کسی کے جانے پر کوئی الوداعی تقریب منعقد ہونے کا عندیہ کھلنے پائے۔ کیونکہ ایسی صورتِ حال میں محکمے کا کوئی بھی ملازم بڑے باس کی ناراضگی مول لینا نہیں

چاہتا۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ بانہال پار جموں میں الوداعی تقاریب کے دوران ایک خاص روایت قائم کی گئی ہے، جس کے مطابق دفتر کا سارا عملہ بشمول افسران ریٹائر ہوئے ملازم کے ساتھ بالکل اسی انداز سے اس کے گھر تک جاتے ہیں جس انداز میں دلہن کی رخصتی کے وقت گھر کے مرد و خواتین دونوں اپنی دلہن بنی بیٹی کا سسرال تک ساتھ دیتے ہیں اور پھر دونوں صورتوں میں ساتھ جانے والے چائے پانی پی کر واپس آتے ہیں۔

قلیل مدتی سرکاری ملازمت اس فلمی کہانی کی مانند ہے جس کا سینما گھر یا ٹیلی ویژن اسکرین پر اُتار چڑھاؤ کے مناظر اور کرداروں کے ڈائیلاگ ساتھ ساتھ چلتے پھرتے، بالآخر اُسی طرح دی اینڈ آجاتا ہے جس طرح ملازمت کے آخر پر ریٹائرمنٹ آجاتی ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج تک ریٹائر ہوئے اکثر ملازمین اپنی سروس کے دوران ڈھیر سارے فائلوں کی دھول چاٹنے پر اِس لئے مجبور تھے کہ سسٹم فرسودہ تھا جو اب انٹرنیٹ کے سہارے بدل گیا ہے۔ ریٹائرمنٹ ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کو حاصل کرنے کے لئے بچپن کا کچھ حصہ اور سارا لڑکپن سرکاری نوکری میں گزارنا پڑتا ہے۔ تب ہی جا کے ایک سبکدوشی

اور دوسرے کے لئے خوش آمدید کے طورا پنے زرین خیالات والے خطابات دینے کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کبھی بھی ملازم کار یٹائر ہونا ویسا ہی ہے جیسا کہ سورج کا ڈوبنا اور نئے افسر کی آمد سورج چڑھنے کی مانند ہوتی ہے۔ پوجا بھی چڑھتے سورج کی کی جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ریٹائرڈ یا تبدیل کئے گئے افسر کے بدلے نئے افسر کی آمد پر بعض محکموں کے ملازمین اُسے اپنے شیشے میں اُتارنے کے لئے تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں۔ اس قسم کی صورت حال میں کسی کا یہ کہنا سچ لگتا ہے کہ ''نئے جب یار ملتے ہیں تو پرانے بھول جاتے ہیں''۔ کبھی کبھی ریٹائرمنٹ کے موقعے پر ہونے والی پُر وقار تقریب منعقد ہونے کے سنہری خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ جاتے ہیں، وہ اس لئے کہ اگر متعلقہ سبکدوش ہونے والے افسر نے انتظامی امور چلاتے وقت ایماندارانہ رویہ اختیار کیا ہو جس سے اس کے اور اعلیٰ ترین حکام کے مابین کوئی اَن بن پیدا ہوگئی ہو تو جب اس کی ریٹائرمنٹ یا تبدیلی قریب ہوتی ہے تو پورے محکمے میں کسی قسم کی ایسی کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی جس سے کسی کے جانے پر کوئی الوداعی تقریب منعقد ہونے کا عندیہ کھلنے پائے۔ کیونکہ ایسی صورتِ حال میں محکمے کا کوئی بھی ملازم بڑے باس کی ناراضگی مول لینا نہیں

چاہتا۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ بانہال پار جموں میں الوداعی تقاریب کے دوران ایک خاص روایت قائم کی گئی ہے، جس کے مطابق دفتر کا سارا عملہ بشمول افسران ریٹائر ہوئے ملازم کے ساتھ بالکل اسی انداز سے اس کے گھر تک جاتے ہیں جس انداز میں دُلہن کی رخصتی کے وقت گھر کے مرد و خواتین دونوں اپنی دُلہن بنی بیٹی کا سسرال تک ساتھ دیتے ہیں اور پھر دونوں صورتوں میں ساتھ جانے والے چائے پانی پی کر واپس آتے ہیں۔

قلیل مدتی سرکاری ملازمت اس فلمی کہانی کی مانند ہے جس کا سینما گھر یا ٹیلی ویژن اسکرین پر اُتار چڑھاؤ کے مناظر اور کرداروں کے ڈائیلاگ ساتھ ساتھ چلتے پھرتے، بالآخر اُسی طرح دی اینڈ آجاتا ہے جس طرح ملازمت کے آخر پر ریٹائرمنٹ آجاتی ہے۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج تک ریٹائر ہوئے اکثر ملازمین اپنی سروس کے دوران ڈھیر سارے فائلوں کی دھول چاٹنے پر اِس لئے مجبور تھے کہ سسٹم فرسودہ تھا جو اب انٹرنیٹ کے سہارے بدل گیا ہے۔ ریٹائرمنٹ ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کو حاصل کرنے کے لئے بچپن کا کچھ حصہ اور سارا لڑکپن سرکاری نوکری میں گزارنا پڑتا ہے۔ تب ہی جا کے ایک سبکدوشی

ملازم باقی ماندہ زندگی ایک بزرگ شہری کی حیثیت سے گزارتا ہے۔ سماج میں اسے صاحب بصیرت اور زیرک سمجھا جاتا ہے۔اسی صفت سرائی سے وہ نہ صرف سماج میں بلکہ سرکاری مشاورتی اور تحقیقاتی کمیٹیوں وغیرہ میں ممبر نامزد ہونے کا اعزاز پاتا ہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد جو ملازم بالخصوص افسر پھر سے کسی خاص سرکاری کام پر دوبارہ تعینات کیا جاتا ہے وہ اپنی گزشتہ سروس کے دوران کئے گئے تجربات کے بل پر معاملات کو دانشمندی سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگرچہ بڑھاپے کی پرچھائیں سروس کے دوران ہی پڑنا شروع ہو جاتی ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کے وقت وہ تازہ دم ہوتا ہے،شاید اس لئے کہ اگر ایک طرف زر گیا،تو ہی زردی چھائی مگر وہیں پنشن کی صورت میں زر آیا تو ہی سرخی آئی۔

شاید اسے ہم انسانی فطرت کہیں یا کچھ اور لوگوں کو ایک ریٹائرڈ ہوئے ملازم کی شخصیت اس کھنڈر کی مانند نظر آتی ہے جو کبھی سماج میں دیگر عمارتوں کے ساتھ ایک عالیشان عمارت تھی۔اگر دیکھا جائے تو دنیا میں ہر جاندار اور بے جان شے کا یہی حشر ہوتا ہے۔

بڑھاپا

بڑھاپا اگرچہ ایک قدرتی عمل ہے لیکن ہے تو یہ ایک بیماری، بڑھاپا انسانی زندگی کا ایک اہم پڑاؤ ہے۔ سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جسے علاج کیا جاسکتا ہے۔ عمر بڑھنا زندگی کے مراحل کا ایک اہم حصہ ہے۔

اس عالم فانی میں بنی آدم کی زندگی کا سفر منزل بہ منزل ہوتے ہوئے سفر آخرت سے قبل ایک ایسے پڑاؤ پر رک جاتا ہے جس کو سماجی زندگی میں بڑھاپا کہتے ہیں۔ اس دوران وہ عدمِ تحفظ اور آلام روزگار کے ساتھ ساتھ خاتمہ بالخیر کے لئے فکر مند رہتا ہے۔ موجوداتِ خارجی میں بنی نوع انسان کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک باضابطہ ایک قدرتی طور وضع کئے گئے نظام کے تحت گزارتا ہے۔ جہاں بے جان اشیاء کو مستعمل ہونے کے بعد بوسیدگی کے باعث ناقابل مرمت یا استعمال یا ناکارہ قرار دیا جاتا ہے بلکہ اکثر چیزیں منسوخ کی جاتی ہیں، وہاں پر انسانی جسم کی عمر طبیعی کی لاغری پر ان کی زیرکی، زمانہ شناسی اور جہاں دیدگی کو بڑھاپے کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔

سرکاری ملازمتوں سے فارغ ہونے والے عمر رسیدہ ملازمین معزز شہری کہلاتے ہیں اوراس پر طرۂ یہ کہ ان بزرگ شہریوں کو سرکار کی طرف سے پنشن کے نام پر وظیفہ بھی ملتا ہے جوان کے لئے بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔

میڈیکل سائنس نے بڑھاپے کے دوران انسانی جسم کو کارآمد بنائے رکھنے کے لئے آٹو موبیل اُورہالنگ کے ڈھنگ پر بعض اعضائے رئیسہ کی ٹرانسپلانٹ کرنے کے عمل جراحی کو بہت پہلے لانچ کر رکھا ہے۔

چنانچہ بنی نوع انسان کو اس عالم کون وفساد میں بچپن سے لے کر شباب تک عمر گزارنے کے بعد ادھیڑ عمر کی طرف گامزن ہونا پڑتا ہے جس کے بعد وہ اس عمر کی دہلیز اُلانگتے ہی بڑھاپا یا پیرانہ سالی میں قدم جماتا ہے۔ بقول شاعر۔

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

بڑھاپا کے کئی نام ہیں جیسے پیری، کہن سالی، پیرانہ سالی، یا یوں بھی پکارتے ہیں جیسے پیرِ مرد، پیرِ زن، عمر رسیدہ بزرگ شہری وغیرہ۔ انگریزی زبان کا مقولہ ہے اولڈ گولڈ ہے۔ گویا اپنی گئی گزری عمر کے سالہا سال کے دوران متعدد مشکلات کے باوجود کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے اور اس طرح سے زندگی کے سفر میں جو کچھ وہ دیکھتا اور سیکھتا ہے اسی کا نام تجربہ ہے۔ ویسے ایسی شخصیت کو سماج میں بڑھاپے کے طفیل پرانا خرانٹ بھی کہا جاتا ہے۔

داناؤں کے کہنے کے مطابق بڑھاپا کی منزل پر پہنچ کر ایک منَش کو یوں سمجھیں، عقلِ سلیم جبکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ بڑھاپے کے باعث عقل سٹھیا جاتی ہے۔ چنانچہ عمر کی تاریخی ترتیب کے گر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لڑکپن سے جوانی تک کا سفر چالیس برس یا اس سے زیادہ تک جاری رہنے کے دوران ہی ایک انسان پر بڑھاپے کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ شاید شاعر ناسخ بھی اس موضوع پر وَجد میں آ کر یہ شعر تخلیق کر گئے ہیں۔

بوڑھا ہو، تیرے بال ہوں اے مہ جبین سفید
کافور کی طرح سے ہو یہ مشک چین سفید

بڑھاپا کے لئے داڑھی کا رکھنا باعث رحمت ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے خدا کا نور بھی کہا گیا ہے۔ ایسے افراد کا سماج میں کافی احترام کیا جاتا ہے۔ اس خاص خوبی کے سبب بڑھاپا کے دِن پورے کرنے والے مرد وزن کو لوگ چاچا، چاچی، بابا، ماں جی، پیرِ مرد، حاجی صاحب، خواجہ صاحب، بہن جی، انکل جی، بھائی صاحب، حضرت جی، وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔

بڑھاپا کے ایام پورے کرنے والے افراد سے جو حضرات مزاج آشنا ہوتے ہیں۔ اکثر ان کا یہی خیال ہوتا ہے کہ ان میں بعض معمر لوگ تلخ وتند تو کچھ شیرین ہوتے ہیں، گویا ان میں کھٹ مٹھا کی آمیزش ہوتی ہے۔ بڑھاپے کی زد میں آئے ہوئے افراد کی ایک اور عزت افزائی یہ ہوتی ہے کہ انہیں پنچایت،

کو اپریٹیو اور مساجد کمیٹیوں کے ممبران اور سربراہان کی حیثیت سے منتخب کیا جاتا ہے۔ دیہات میں بالخصوص ان کی عوامی عدالتوں میں شرکت یقینی بنائی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات نمٹانے اور قضیے چکانے کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔کہیں کہیں پر یہ لوگ لوکل پولیس سٹیشن کی مختلف عوامی امور حل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ بدیشی ممالک میں بڑھاپا کا زیادہ قدر ومنزلت سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔عالمی سطح پر بھی بزرگ شہریوں کے لئے بہت ساری سہولیات میسر ہیں۔ بڑھاپا بلا شبہ قدرت کی ایک انمول نعمت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عشق اور مُشک کی خوشبو ضرور ظاہر ہو کر رہتی ہے۔اسی تناظر میں ایک کشمیری کہاوت کے مطابق بوڑھے کا عشق، مُشکِ مہر ہوتا ہے۔گویا بڑھاپے میں شوقین مزاجی، سج دھج، حرصا حرصی جیسی علامتیں بھی نمودار ہونے لگتی ہیں جبکہ ''بڑھیا دیوانی ہوئی پرائے برتن اٹھانے لگی'' کے مترادف مطلب کی دیوانی ہوتی ہے۔ بڑھاپا کے گروہ میں شامل مرد وزن میں کچھ ایسے کھنڈر بنے چہرے بھی ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ انسانی ڈھانچے بھی کبھی عالیشان عمارتیں تھیں۔

اس حقیقت کو کوئی مبالغہ تصور نہیں کرے گا کہ بڑھاپا کا اطلاق سیاست دانوں پر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ سیاسی فیلڈ میں حظ اٹھاتے عمر نوح پانے تک کی آرزو میں مُستغرق ہوتے ہیں۔عمر رسیدہ ہو کر بھی ان کی زندگی سرکاری

خاطر داری کی بدولت سدا بہار ہوتی ہے۔کسی شاعر نے بھی ایک دوسرے انداز میں ان کی ناشکیبائی کی طرف بالواسطہ اشارہ کیا ہے۔

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بچپن سے لے کر بڑھاپا تک کی زندگی کے سال ماہ اور دِن مجموعۂ شماریاتِ ہوتے ہیں جبکہ اس عرصہ دراز کے دوران جمع ہوئے مشاہدات اور تجربات مجسمہ،حیات ہوتے ہیں۔

بڑھاپا کے روپ بدلتے رہتے ہیں،کہیں پران کا رنگ ڈھنگ سیاسی لیڈروں کے اُتھلنے کے ہو بہو ہوتا ہے۔والدین میں جب بڑھاپا آتا ہے تو اولادِ ذکور اور اولاد اُناث کا خدمت گزاری کے امتحان میں پورا اُترنے یا نہ اُترنے پر بحثیں چھڑنے لگتی ہیں۔سرکاری ملازمین کے لئے عہدوں سے ریٹائر ہونا ہی بڑھاپے کی چِتاوَنی ہوتی ہے۔تاہم ماہوار پنشن یعنی کہ نوکری سے فارغ ہونے پر ماہوار وظیفہ ان کے لئے زادِ راہ ثابت ہوجاتا ہے۔سماج ایک اور قسم کے بوڑھے افراد کی ایک جم غفیر ہوتا ہے جن میں سے گنتی کے کچھ ضعیف العمر افراد کو سرکار کی طرف سے آٹے میں نمک کے برابر ماہانہ اولڈ ایج پنشن دیا جاتا ہے۔باقی عمر رسیدہ لوگ اپنے ناتوانی کے دن یا تو ہنستے ہنستے صالح اولادوں کے ساتھ یا علاحدگی میں آہیں بھرتے ہوئے اولادِ خُلف کے ساتھ گزارتے ہیں۔

چہرے

صانع مطلق نے بنی نوع انسان کے جسم پر سر اور ٹھڈی کے درمیان سانچے میں ڈھلا ہوا کثیر المقاصد چہرہ بنا کر اپنی لاثانی قدرت کی کاریگری کی تاریخ رقم کر کے رکھی ہے۔ چنانچہ ٹیلی ویژن، سینما اور کمپیوٹر کی اسکرینوں سے مشابہ انسانی چہرہ عجائباتِ قدرت میں سے ایک ایسا عجوبہ روزگار ہے کہ جس میں قوتِ باصرہ کے لئے آنکھیں، قوتِ گویائی کے لیے زبان، قوتِ سامعہ کے لئے کان اور قوتِ شامہ کے لئے ناک مناسب جگہوں پر فٹ کئے ہوئے ہیں۔ انسانوں کو اگر یہ چہرے نہ ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے کی جان پہچان کرانا مشکل ہوتا۔ دنیا میں ہر انسان اور ہر شے کی ساخت دوطرفہ ہوتی ہے۔ جسم کا اوپری حصہ سر، چہرہ اور دیگر جسمانی رونق افزا اعضا کے ساتھ ایک گل داں کی مانند ایک نرم و نازک گردن پر کھڑا ہے اور جس کی پائیداری مافوق الفطرت ہے۔ کسی بھی جاندار جسم یا بے جان شے کی پشت یا پچھلی طرف کو دیکھ کر اُسے پہچاننا ناممکن ہے۔ تاہم سامنے کی طرف چہرہ دیکھنے سے بہت سارے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں۔

میرے خیال میں کسی کی قسمت کا حال، ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بجائے چہرے مُہرے کا بھرپور جائزہ لینے سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک انسان اپنے جینے مرنے کے اوقات سے بے خبر ہوتا ہے اسی طرح وہ جسم پر لگے چہرے کو کبھی بالمشافہ دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا اگر بدلتے زمانہ کے آئینہ ساز نے اُسے یہ سہولیت بہم نہ پہنچائی ہوتی۔

اگرچہ اکثر حضرات کی رائے ہے کہ چہروں سے ایک انسان فریب کھاتا ہے جبکہ بعض حضرات چہرے کو دل کا اِشاریہ یعنی کہ کسی کتاب کے مضامین کی تفصیلی فہرست کی مانند دل کے اِرادوں کا منبع تصور کرتے ہیں۔ موجودہ وقت میں کسی بھی فرد کا چاہیئے وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، حلیہ تحریر کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ شکل وصورت اور خط وخال سے مراد چہرے کی کیفیت ہے۔ چہرہ بنانے یا بگاڑنے کی داستان کچھ الگ نوعیت کی ہے۔ بہرحال یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شادیوں سے قبل لڑکے، لڑکیوں کے چہرے مُہرے دیکھ کر اپنی اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں لیکن مرد کے چہرے کا ذکر شاذ شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ بہرحال خاتون کا چہرہ داؤ پر لگانے کی رسم صدیوں سے چلی آئی ہے مگر افسوس کہ شاید ہمارے سماج نے بنتِ حوا کو حق استزاد سے نامعلوم وجوہات کی بناء پر محروم کر رکھا ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی نسوانی چہرے باعثِ نزاعِ لفظی بن جاتے ہیں۔ انسانی فطرت میں یہ عیب بھی

ابتدائے آفرینش سے شامل ہے کہ مرد حضرات چاہئے بزرگانِ سالہا سال بھی ہوں اجنبی خواتین پرٹکٹکی باندھتے ہیں یا کسی مانع امر کے، ان کے چہروں کو کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قدرت کی مثالی فنکاری سے چہرے کو گویا حسین امتزاج کیمیائی سے اپنا ایک یکتائے زمانہ وجود ملا ہے، جس کے ثبوت میں منہ، مُکھ اور رخسار کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ رخسار میں رخ کا اطلاق پورے چہرے پر ہوتا ہے، برخلاف رخسار جسکے معنی گال کے ہیں اور مجازاً بمعنی رخ مستعمل ہے۔ رخسار کا بالائی حصہ رخسارہ کہلاتا ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے ادب پاروں میں چہرے کی رنگت، زردی، سفیدی، چمک دمک، پھیکی صورت، آنکھوں کی جھپک، روشنائی، پردہ نشینی اور نقاب کشائی کی اداؤں کو غضب کا اظہار بخش دیتے ہیں۔

بہر حال چہرے چاہیئے انسانوں کے ہوں یا چرندوں، پرندوں، درندوں کے ہوں یا پھر بے جان جمادات کے ہوں، سبوں کے چہرے سامنے سے ہی صورت آشنا ہونے کا اشارہ دیتے ہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ خاص کر سینما اور ٹیلی ویژن کے کام کاج میں چہروں کی ہیئات بدلنے پر زور دیا جاتا ہے۔ جو عمل، وقتی طور سونے پہ سہاگا لگتا ہے اور متعلقہ کارندوں کے لئے سونا چاندی ثابت ہو جاتا ہے۔ ایسے حضرات چہروں کے بنانے، بگاڑنے اور چمکانے سے نہ صرف فلمی یا ڈرامہ شائقین کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے

ہیں بلکہ دیگر تماشائیوں کے لئے جاذبِ نظر مناظر پیش کرتے ہیں۔

بنی آدم کا چہرہ الٹراساؤنڈ کی مثل ایک انسانی عضو ہے۔جس سے ایک فرد کی داخلی صورتِ حال کی تشخیص خام کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ آج کل چہروں کے اسٹائل بناؤ سنگار سے بدلائے بھی جاتے ہیں یا یوں سمجھیں کہ مسخ بھی کئے جاتے ہیں۔تاہم ادھیڑ لوگ شباب لانے کی ہوس میں خضاب اور میک اَپ کر کے بالوں کی سیاہی اور چہرے کی آرائش کرتے ہیں۔

گھونگٹ والی خواتین کے چہرے مرد وزن کے مخمصوں میں رائے دہندگان کی طرح غیر جانبدار رہ کر زندگی گزارنے کا عندیہ دیتے ہیں۔کہا جاتا ہے بلکہ عام مشاہدہ بھی ہے کہ نقاب پوش خواتین اپنے چہروں سے حجاب ہٹانے میں سخت رویہ ہوتی ہیں البتہ دلہنوں کے معالے میں لین دین شامل رسم ہونے کے سبب ساس کے ذمہ نئی دلہن کا گھونگٹ اٹھانا مقصود ہوتا ہے جس کے لیے وہ دونوں پہلے سے ہی آمادہ ہوتی ہیں، اس طرح سے دلہا کے خویش واقارب کو دلہن کے چہرہ مُرہ کو بغور دیکھنے کا چانس ملتا ہے۔تاہم دلہنوں کے چہروں کے حسن و جمال کو دیکھنے کے لئے خاص وعام کا مشتاق بیٹھنا ایک فطری تقاضا ہے۔تاریخی طور یہ حقیقت بھی سَند رہی ہے کہ مجنون کو جب لیلیٰ کی صورت کالی ہونے کا طعنہ دیا گیا تو اس نے جواباً

کہا تھا ’’لیلیٰ کو میری نظر سے دیکھو‘‘۔

دنیا میں انسانوں کے چہرے سدا ہیئتِ اصلی پر قائم نہیں رہتے ہیں بلکہ موقع بہ موقع کی مناسبت سے مصنوعی ہیئات دھارنے لگتے ہیں۔ کتنا بڑا دھوکا کھانا پڑتا ہے ایسے چہروں کے پہچاننے میں جو حقیقی دکھائی نہیں پڑتے ہیں۔ دراصل انسانوں کے مزاج کبھی بھی ایک حال پر نہیں رہتے ہیں بلکہ کبھی ساتویں آسمان پر تو کبھی رنگین ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت میں شرارت، کدورت، خندہ پیشانی اور دبی ہنسی جیسی کیفیات چہرے کی اصلیت کو عارضی طور بدلتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جنہیں دوسروں کے چہرے کے تیور بوجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے جبکہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو چہروں کے تیور دیکھنے یا تاڑ جانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ کسی کے گھر میں مہمان بن کر جاتے وقت اگر میزبان کے چہرے کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جائے کہ اُس کا چین بجبین ہوا ہے تو تُرنت واپسی بہتر ہے۔ آتش کا شعر ہے۔

چین بر جبین نہ اے بت چین رہ غرور سے
تصویر کا ہے عیب جو چہرہ بگڑ گیا

خخخ

صبر

کسی ہنگامی نوعیت کے کام کے کرنے یا کسی بُری خبر کے سُننے کے وقت بے تابی یا جلدی کا مظاہرہ کرنا بنی آدم کی فطرت میں ہے تاہم ان میں بعض قلیل تعداد کے لوگ اپنا ردِ عمل پیش کرنے میں کوئی تعجیل یا شتابی نہیں دِکھاتے ہیں، پس ان کی اسی خوبی کا نام صبر ہے۔

داناؤں کا قول ہے کہ صبر کڑوا ہوتا ہے لیکن اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

آج کل کے زمانے میں زیادہ تر لوگ مایا جال کی وجہ سے صبر کا یارانہ نہ رہنا اپنی بھلائی کے لئے ٹھیک سمجھتے ہیں۔

صبر سے مراد برداشت، طمانیت، تسلی، راضی، خوش، بُردباری، تحمل، توقف، تامُل اور اطمینان ہے۔ صبر کی نمائندگی کرنے میں برداشت کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی لیکن موجودہ حالات میں لوگ عدمِ فرصت کے بہانے صبر وشکر کرنے سے منہ چراتے ہیں۔

زمین پست ہونے کے سبب بے شمار پاؤں تلے ملنے، طرح طرح کے کوڑا کرکٹ کے جمع ہونے اور دیگر موجودات کے بوجھ اٹھانے

سے عاجز نہیں آتی ہے بلکہ ان تمام بوجھوں کی تکالیف کو نہایت نرمی اور فروتنی سے برداشت کرتی ہے۔ زمین کے اس صبر کا اس سے میٹھا پھل اور کیا ہوگا کہ یہی غلّہ جنس بھی اُگاتی ہے اور سونا، چاندی، ہیرے، موتی اُگلتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پانی کی بے صبری کا یہ حال کہ دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور ندی نالوں میں انسانوں کی طرف سے اس کا بے جا صرف کرنے اور اس میں ہر قسم کی گندگی ڈالنے کو قطعی طور برداشت نہ کرتے ہوئے سوکھ جانے کی ٹھان لی ہے۔ جس سے متاثرین میں ہاہا کار مچی ہے۔

معاشرے میں صبر کرنے کی ایک غیر معمولی اور ریکارڈ توڑ مثال قائم کرنا بیٹیوں کے مقدر میں لکھا ہے۔ ایک بیٹی بیاہنے کے بعد اپنے میکے کے گھر سے رخصت ہوتے ہی پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ گویا ایک بیٹی کا مروجہ رواج کی رو سے اپنے بچپن کے گھر اور تمام قریبی رشتہ داروں کو خیر باد کہنا چارہ پزیر نہیں ہوتا۔ فی الاصل پرایا دھن کے لئے پرائے گھر کا ہونا لازوال نوشتۂ تقدیر ہے۔

غور طلب ہے کہ انسانی زندگی کے سفر کے دوران ایک خاتون کو ایک ماں کا روپ دھاری ہونے کے لئے صبر آزما امتحان کی مرحلہ وار کٹھن کڑیاں اٹھانا پڑتی ہیں۔ ایک ضرب المثل ہے ”جلنا اور مرنا برابر ہوتا ہے“۔ دراصل بچہ جلنے میں ایک ماں یا پھر زچہ بچہ دونوں کا ایک ساتھ جان

جانے کا ڈر ہوتا ہے، فی الواقع ایک عورت نو ماہ تک اپنے بچے کو پیٹ میں برداشت کرتی ہے۔ جس کے بعد اس کے لیے دردِ زہ کا مرحلہ آجاتا ہے جسے سہنے کے بعد اُسے یا تو حمل گرانے کی نوبت آجاتی ہے یا پھر بے چارگی کے حالات میں بچہ پیدا کرتی ہے۔ ان تلخ آزمائشوں سے گزرنے والی عورت کو صبر و شکیب کی رانی کہنا اور ایسی ماؤں کے صبر جمیل کو سلام کرنا شیوہ انسانی ہے۔

ایک زمانے میں کتے کھانے کی چیزوں کے لیے بھونکتے رہتے تھے لیکن انسانوں کا ان پر بلا وجہ پتھر پھینکنے پر چپ چاپ بھاگ جانے سے اپنی خیر مناتے تھے۔ آج کل یہ اِتنے بے صبر ہو گئے ہیں کہ کسی بھی فرد کو دیکھتے ہی اس پر بھونکنا شروع کر دیتے ہیں، کہیں کہیں پر پتھر پھینکنے والے افراد کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی فرد کا کتے کے کاٹنے سے زخمی ہونا اُسے مہنگا پڑتا ہے لیکن اس پر بھی صبر کی سِل چھاتی پر رکھنا لازمی ہوتا ہے۔

اقتصادی محاذ پر اگرچہ اوسط آمدن کے بڑھانے کی خاطر وسائل تلاش کرنے کی کوششیں جاری رہتی ہیں لیکن اوسط بے صبری میں بے تحاشا اضافہ ہونے سے لوگوں کے ترقیاتی منصوبے تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لوگوں کے بے تابانہ رجحان کے سبب ایک ایسی دیکھا دیکھی

پروان چڑھنے لگی ہے جس سے متوازن ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونا بعید از امکان دکھائی دیتا ہے۔ ویسے بھی ہماری زندگی کے قول و فعل میں جلد بازی کرنے کا عمل پورے حواسِ خمسہ سے جاری رہتا ہے۔ کھانا کھانے کی جلدی، کل نہیں آج ہی سفر پر جانے کی جلدی، میزبان کے گھر سے اپنے گھر جانے کی جلدی، نئی چیزیں لانے کی جلدی وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ جلدیاں ہیں جو آئے دن ہماری روزمرہ زندگی کو پریشان کرتی رہتی ہیں۔ جب تک نہ انسانوں کا بے تابی اور جلد بازی کرنے کا رجحان تبدیل ہوگا۔ سوچ سمجھ کے منصوبہ بندیاں عمل میں لانا ناممکن ہی نہیں بلکہ ناقابل عمل بنا رہے گا۔

ایک اور شکیب رُبا معاملہ جو کہ درد آمیز ہونے کے باوجود سماج کی نظروں سے اوجھل رہا ہے، مویشیوں یعنی کہ چوپایوں پر بنی نوع انسان کے ظلم ڈھانے سے متعلق ہے۔ دراصل بعض ظالم اظلم مالکاں اور چرواہے ان حیوانات کا گھاس کھِلانے کے لئے اِدھر اُدھر لے جانے کے دوران کوڑے، چابک، قمچی یا چھڑی سے کچومر نکالتے ہیں۔ حضرت انسان گھوڑوں سے سواری اور بار برداری اور بیلوں سے کولھو پیلنے اور ہل چلانے کے کام لینے کے دوران بچارے گونگے حیوانات کو ہنٹروں اور تازیانوں سے مار مار کر موم کر دیتا ہے۔ حسرت کا مقام ہے کہ ان چوپایوں کے صبر کی انتہا بھی نظرانداز ہو جاتی ہے۔

انگریزی زبان کے دو مشہور محاورے ہیں ''تھنک بفور یو سپیک'' اور ''لک بفور یو لیپ'' گویا کوئی بھی بات کہنے یا کام کرنے سے قبل بھرپور مشاہدہ اور غور وفکر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی مشاہدہ اور غور وفکر کرنے کا عمل صبر ہے جو آج کل کی دنیا میں خال خال ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے، ملے گا بھی کہاں جب ہر کوئی پل بھر کی فرصت نہ ہونے کا رونا روتا رہتا ہے۔

اردو زبان کا ایک ضرب المثل ہے ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' گویا صبر وسکون سے کیا گیا کام بہتر ہوتا ہے۔ یوں تو صبر کا معاوضہ جلدی میں نہیں بلکہ تاخیر سے ملتا ہے، ایک پرانی کہاوت ''دیر آید درست آید'' بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ موجودہ انسانوں کی آپا دھاپی کا یہ حال کہ ہر کوئی گھوڑا نہ ملے دیوار پر ہی سہی، سواری کرنے کی جلدی میں ہے۔

پچھلے کئی برسوں سے طالب علموں کا رجحان قلیل المُدتی کورسوں کی طرف اس وجہ سے بڑھتا جا رہا ہے کہ لمبی مدت کے کورسوں میں لمبے انتظاروں کے بعد نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ گویا زمانے نے پلٹا کھایا ہے۔ صبرِ ایوب کی بات کیا کریں اب تو لوگ خالص صبر جمیل کا رِسک بھی لینا نہیں چاہتے۔

بہر حال ہم کب تک صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے کی دوہائی دیتے رہیں گے؟ کیا ہمیں اس بات کا اعتراف نہیں ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے، گفتگو کرنے، لکھنے پڑھنے، کھانے پینے، سفر کرنے

وغیرہ میں ''تحمل''، ''توقف'' اور ''انتظار'' کو ''تعجیلی''، ''پھرتی''، ''تیزی'' اور ''جھٹ پٹ'' میں بدل دیا ہے۔ لمبی مسافتیں اب کلومیٹروں میں نہیں بلکہ گھنٹوں، منٹوں اور سیکنڈوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اگرچہ انٹرنیٹ کی بدولت صبر وشکر کی حدود اختیار میں اپنی مداخلت سے جلد بازی کرنے کو تیز دستی، تیز رفتاری، تیز فہمی، تیز قدمی، تیز قلمی، تیز گامی اور تیز نگاہی وغیرہ کے متعارف ہونے سے توثیق نصیب ہوئی ہے لیکن پھر بھی بہت سارے معاملات اور واقعاتِ زندگی ہنوز موجود ہیں جن کے لئے تامل، توقف، تاخیر، تحمل، انتظار، یا ٹھہراؤ کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

دِل

فی الواقع انسانی جسم کے اعضائے رئیسہ میں دل پہلے نمبر پر ہے۔ اس کی جملہ مصروفیات درپردہ ہوتی ہیں، جن کے مثبت یا منفی اثرات کبھی یکا یک تو کبھی گاہ بہ گاہ دیرسویر ظاہر ہوجاتے ہیں۔ اگر خدا نے بنی نوع انسان کے جسم کو دھڑکنے والے دل، دیکھنے والی آنکھوں، سننے والے کان، بولنے والی زبان اور سوچ بچار کرنے والے دماغ سے آراستہ نہ کیا ہوتا تو وہ مُردے سے بدتر ہو کر رہ جاتا۔ بے شک دل اپنی گُوناگوں خصوصیات کی بناء پر جسم کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ آنکھیں، زبان، کان اور دماغ کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی اس کے معاونین میں شامل ہے۔ ایک انگریزی قول کے مطابق چہرہ دل کا آئینہ یا عکس ہوتا ہے۔

لغوی لحاظ سے دل جسم کا ایک اہم عضو ہے۔ جس کا کام داخلی طور رگوں میں خون پہنچانا ہوتا ہے۔ گویا یہ دِل بجلی ٹرانسفارمر کی مانند جسم کے رگوں میں برقی رو کی بہمرسانی کے ہو بہو خون کی سپلائی کرنے کا ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جو چار حصوں میں منقسم ہے۔ دل کے اور کئی معانی ہیں جو اس طرح سے

ہیں ۔قلب، ہرداِ، حوصلہ، جرأت، دلیری، ہمت، خواہش، رغبت، توجہ، عندیہ، مرضی، خوشی، سخاوت، درمیان، وسط، مرکز، کسی شئے کا باطن وغیرہ۔

اصل میں چہرہ دل کا ایک ایسا آئینہ ہے جس کا کام سی ٹی وی کیمرہ کی طرح احوال دل کے اتار چڑھاؤ کی تصویریں اتارنا مقصود ہوتا ہے۔ جب جب اپنے احساسات پر قابو پانے سے دل بحال ہو جاتا ہے، چہرہ اس کے خوش آئند روپ کا مظہر ہوتا ہے۔

دل کا ایک اور خاص مگر منفرد نام ضمیر ہے۔ضمیر بجائے خود دل کے احوال کو کسوٹی پر چڑھانے کا ایک پیوستہ ذریعہ ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔خفتگاں کی جب اکثریت ہوگی تو سوال کرنا بنتا ہی ہے۔''خفتہ را خفتہ کے کنند بیدار'' ضمیر کی صورت میں دل اپنے اندر، اپنے آپ کا مُحاسب ہوتا ہے۔کسی شاعر نے دل پر یہ شعر لکھا ہے۔

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

شعر و ادب میں دل کو خاص مقام ملنا نصیب ہوا ہے کیونکہ شاعری، ناول اور افسانہ نگاری میں احساساتِ دل کی خوب توضیح اور تشہیر ہوتی ہے۔ شعراء حضرات اپنی سخن گوئی میں دل کی حسین و جمیل صورت اپنے اشعار میں خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔سخن گوئی کی تعریف میں کسی شاعر نے کیا

خوب کہا ہے۔

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

دل سے منسوب ایک قول ''دل بدست آور کہ حج اکبر است'' گویا کسی غمزدہ کو دلاسا دینے میں اَجر ہی اجر ہے۔ اگر ہم کسی مصیبت زدہ انسان کے دل کا کنول کھلنے کے اقدام اٹھاتے ہیں تو اس سے ہمارا دل بھی جوان رہتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس دردِ دل کو ہر کوئی فرد اپنا نصب العین بنائے۔ دل ہی کو معلوم ہے کہ دوسرے کے دل ہی دل میں کیا ہے۔ سماجی کاموں کو کامیابی سے انجام دینے کے لئے ایک کارکن کے دل میں لگن لگنا ضروری ہے۔ دل آب گینہ بھی کہلاتا ہے۔ جس سے مراد دل کا شیشے کی طرح نازک ہونا ہے۔ اگر بالفرض کوئی میاں اپنی مخلص بیوی کو ناحق میں پھٹکارتا ہے تو کہنے کے لئے یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس نے اپنی بیوی کا شیشہ دِل چور کیا۔ کیونکہ حقیقت میں ایک عورت کی نازک مزاجی شیشہ کے متشابہ ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ''شیشہ بشکستہ راپیوند کردن مشکل است''۔

احقر نے غور وخوض کے بعد محسوس کیا ہے کہ اوسط دل کی وضع بدلنا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی نوع انسان کی زندگی میں اکثر اوقات انتشار یا انبساط کی کیفیتوں کا لامُتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے جن کا مظاہرہ چہرہ بگڑنے یا

چہرہ چمکنے سے ہوتا رہتا ہے۔ اگر ہم دل کے افعال جن کی ایک لمبی فہرست درج ہے، گنوانے بیٹھیں تو ایسا کرتے نہ جانے کتنے کاغذ سیاہ کرنے پڑیں گے۔ انسانی جسم میں دل کی عظمت ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان لاکھ جتن بھی کرے، دل کی ساری صورتِ حال بغیر وقت لئے واضح نہیں کرسکتا۔

تاہم عقل حیران ہے کہ دل کے اندر متعدد کیفیتیں، صورتیں اور ہیئتیں کہاں اور کس جگہ سما جاتی ہیں۔ دل خود مختار ہے، داخلی اور خارجی احساسات سے نپٹنا دل کے اپنے منشا پر منحصر ہے۔ سود و زیاں کا خیال رکھنا خود دل کی اپنی صواب دید ہے۔ اگر خدا نے انسانوں کو دل نہ دیے ہوتے دنیا میں کمالات انسانی کا ظہور پذیر ہونا محال ہوتا۔

فی الواقع دل کی یہ خاصیت ہے کہ اچھی خبر سُن کر پھولے نہیں سماتا اور بری خبر سُن کر پریشان ہو جاتا ہے۔ دل محبتوں کا منبع، غموں کا سمندر اور ارادوں کا سرچشمہ مانا جاتا ہے۔ اس دنیا میں انسانوں کے درمیان تمام قسم کی آپسی تعلق داریاں دل سے ہی بنائی اور مٹائی جاتی ہیں۔ دل کی زیادہ تر بیماریاں نفسیاتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ڈپریشن اور ٹینشن دو خاص بیماریاں ہیں جن سے بلڈ پریشر کی بیماری معرض وجود میں آجاتی ہے اور جو دل کے لئے ہر لحاظ سے وبال جان ہے۔ لہٰذا حفظِ ماتقدّم کے طور دوائیاں لینے کے ساتھ ساتھ نمک دشمن پالیسی اپنانا دل کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔

دل کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ عشق کو عشق کعبۃ اللہ، عشق حقیقی، عشق مجازی میں منقسم کیا ہے۔ سچ ہے کہ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

انگریزی زبان کا مقولہ ہے ''نظر سے اوجھل، دل سے اوجھل'' مجھے اس قول سے قطعاً اتفاق نہیں ہے کیونکہ ایک بار جو نظروں میں سماتا ہے اس کی بار بار یاد آتی ہے۔ کسی نے کیا خوب بات کہی ہے۔ ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں''۔ ہم دل کو خانہ خدا بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس میں اللہ کی یاد رہتی ہے۔ دنیا میں وہ کوئی بشر نہیں جس کا دل کوئی بُری خبر سُن کر دھڑکتا نہیں تاہم بہت کم لوگ ایسے موقعوں پر دل پر پتھر رکھ لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ دل کے حالات بدلنے اور مختلف رنگ ڈھنگ کی کیفیات اختیار کرنے کی داستان اگر ہم لکھنے بیٹھ جائیں تو بے شمار صفحاتِ قرطاس سیاہ ہو جائیں گے۔ دراصل انسانی زندگی کے گزر بسر کرنے میں دل کا رول فیصلہ کن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں دل کے اثرِ رسوخ سے آگے بڑھنا یا تو آسان ہو جاتا ہے یا اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے، ایک اُستوار زندگی گزارنے کے لئے دل سے ہر قسم کا غبار دھل جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ داناؤں کا قول ہے ''دل کو ہو قرار تو سب کو سوجھیں تیوہار''۔ جب سے انسانوں کی نیتیں ڈانواڈول ہونا شروع ہوگئیں، دل کو دل سے راہ ہونے میں بھی بگاڑ پیدا ہوگیا۔ جس کے لئے دنیا میں کسی قسم کا مرہم دستیاب نہیں ہے۔

شرافت

زبان دانوں نے شرافت کو ایک پیشہ قرار دیا ہے۔ اور جو زیادہ شریف ہوتا ہے اس کو شرافت پناہ موسوم کیا ہے۔ عموماً لوگ کسی انسان کی ظاہری صورت دیکھ کر اس کے شریف یا رذیل ہونے کا بلا توقف اظہار کرتے ہیں حالانکہ جس طرح ہر چمک دار چیز سونا نہیں ہوتا بالکل ویسے ہی ہر بھولا بھالا شخص شریف نہیں ہوتا۔ قاعدے کی بات ہے کہ دنیا میں ہر کوئی چیز مُثبت اور منفی دونوں اثرات رکھتی ہے۔ بالفرض اگر زمین کا آسمان کے مقابلے میں پست ہونا اس کی شرافت کی لیل ہے تو پھر انانوں کی شرافت بھی زمین کی طرح شرارتی ہونے کی سند رکھتی ہے۔ زمین کی پستی جب زلزلوں سے ہل چل مچاتی ہے اور خاموشی سے چلتے دریا جب طغیانی پر آتے ہیں تب پتا چلتا ہے کہ شرافت اور شرارت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اگرچہ شرافت سے مراد بزرگی، اصالت، نجابت اور بھلمنسی وغیرہ ہے لیکن بعض لوگ شرافت کو دو علاحدہ لفظوں شر اور آفت سے تعبیر کرتے ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شرارت سوجھنا پڑتی ہے جبکہ شرافت ایک پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

کیوں نہ ہم بھی شرافت کی اصلیت جاننے کے لیے علامہ اقبال کی طرح ''کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں'' کا سہارا لے کر رازِ سربستہ کو افشا کرانے کی کوشش کریں، ممکن ہے یہ معّما بھی حل کرنے کی راہ نکل آئے۔ اگر بغور جائزہ لیں تو یہ دنیا انسانوں کی نہیں بلکہ شریفوں اور رذیلوں کی آماج گاہ معلوم ہو جائے گی۔ جہاں شریف کی معانی بھلا مانس، بزرگ، اصیل، اعلیٰ خاندانی، مہذب وغیرہ ہیں وہاں رذیل کی معانی سفلہ، فرومایہ، کمینہ، پاجی وغیرہ ہیں۔ البتہ شرافت پہچاننے میں اس لئے کن فیوژن ہوتا ہے کہ لوگ جتنے منہ اتنی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ کبھی نرم ملائم باتیں کرنے والے پر شرافت کی لیبل چسپاں کی جاتی ہے تو کبھی سادہ وضع اور خاموش طبیعت والے کے حق میں شرافت کی سند جاری کی جاتی ہے۔ فقیری، درویشی، نرم روی، نرم مزاجی، بھولا پن، سادہ لوحی، سُستی، لاغری، ناتوانی وغیرہ بھی اسی قبیل کے سانچے میں ڈھالنے سے شرافت کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔ مزید برآن معصومیت اور کم گفتاری دونوں کیفیتیں بھی شرافت کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ حقیقی شرافت کا مفہوم ابھی بھی انسانوں کی فہم و

ادراک سے کوسوں دور ہے۔

پتے کی بات یہ ہے کہ کسی بھی سماج میں بعض رذیل خصائل کے لوگ شرافت کا لبادہ اوڑھ لینا اپنے ذاتی مفاد کے لئے ضروری سمجھتے ہیں گویا ''اوڑھ لی لوئی تو کیا کرے گا کوئی''۔ بہر حال اِس موقع پر احقر کو مولانا روم کی ایک حکایت یاد آئی۔۔۔'' کہتے ہیں کہ ایک چڑیا اور چڑا ایک درخت کی شاخ پر بیٹھے تھے۔ دور سے ایک شکاری آتے دکھائی دیا۔ چڑیا نے چڑے سے کہا چلئے، اب ہم اُڑ جائیں گے یہ ہمیں مار دے گا۔ چڑا نے کہا ذرا دیکھو اس کی دستار پہنی ہوئی صورت سے شرافت ٹپک رہی ہے۔ یہ ہمیں کیوں مار دے گا۔ جب شکاری قریب پہنچا تو تیر کمان سے چڑا کو مار دیا۔ چڑیا فریاد لے کر بادشاہِ وقت کے پاس چلی گئی۔ شکاری کو طلب کیا گیا۔ اس نے اپنا جرم قبول کیا۔ بادشاہ نے چڑیا کو سزا کا اختیار دیا کہ جو وہ چاہیے وہی سزا شکاری کو دی جائے گی، چڑیا نے بادشاہ سے فقط اتنی سی بات شکاری کو بولنے کے لئے عرض کی کہ اگر وہ شکاری ہے تو لباس شکاریوں کا پہنے، شرافت کا لبادہ اتار دے''۔

اگر چہ بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز حاصل ہے لیکن شرافت یا رذالت نصیب ہونا ایک فطری سعادت یا شقاوت ہے گویا جس کے حق میں جو لکھا گیا ہو وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا میں فطری شرافت

والے لوگ شریف النفس کہلاتے ہیں۔ اس تناظر میں شرافت ایک مستقل پیشہ قرار دی جاسکتی ہے۔کیونکہ کوئی فرد شریف الطرفین بھی ہوتا ہے گویا ماں باپ کی شرافتوں کا وارثِ صُلبی۔البتہ جو لوگ شرافت کا لبادہ اوڑھنے کی ڈرامہ بازیاں کرتے ہیں ان کا اوڑھنا اتارنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

بعض حیوانوں اور جانوروں کے معصوم اور خوبصورت چہرے کسی بھی اِنسان کا دِل موہ لیتے ہیں۔بھیڑ بکریوں میں بالخصوص گائیں اور لیلےٰ انسانی ہاتھوں چھونے اور گدگدی کرنے کے جواب میں چومنے چاٹنے کی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔لہٰذا حیوانوں اور انسانوں کے مابین شرافت کے ایک مشترکہ وصف ہونے کا گمان قوی ہوتا ہے۔

چنانچہ ''شریف یا شرافت'' ایک کلمہ تعظیم بھی ہے جو شہروں اور مقدس مقامات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہ مکہ شریف، مدینہ شریف، مسجدِ شریف، قرآنِ شریف، بخاری شریف، درود شریف، ختمِ شریف، زیارتِ شریف، مزارِ شریف وغیرہ گویا شرافت واقعی وہ پیشہ ہے جو تمام حقیقی شرفاء کے لئے اس عالم فانی میں مقدس عطیہ خداوندی ہے۔

چنانچہ شہر و دیہات میں اِزدِواج سیزن کے دوران لوگ شرافت برانڈ خصلت کا جوڑ ملنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، گویا کسی بھی خاندان

کے لوگ، چاہیے امیر ہوں یا غریب، اپنے بیٹے کے لئے شریف لڑکی یا اپنی بیٹی کے لئے شریف لڑکا تلاش کرنے کے لئے درمیان داروں کو کام پر لگاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں پریواروں کے شرافت سے متعلق نظریات ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ایک اور غور طلب بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں، دفتروں، کارخانوں، سماجی اور سیاسی تنظیموں اور مذہبی اداروں میں لوگ ان سربراہوں کی شرافت کی داد دیتے ہیں جو انہیں ڈھیل بھی دیتے ہیں اور کسی کوتاہی پر جواب طلبی بھی نہیں کرتے ہیں لیکن ایسے حضرات کی شومی قسمت دیکھیں کہ زیر فرمان لوگ انہیں ''بچارے شریف'' کے نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ صدیوں سے لوگ سادہ لباس، شرم حضوری، سادگی، شرم ساری اور راست بازی کو شرافت کے اجزائے ترکیبی تصور کرتے آئے ہیں۔

راستہ

بنی نوع انسان کے چلنے پھرنے، زندگی گزارنے اور سفر کرنے کے لیے راستے مقرر ہیں۔ سیدھی چال چلنا اس کا رویہ ہونا چاہیئے، اگر وہ سیدھا راستہ لیتا ہے تو اُس کے لیے اپنی منزل مقصود کو پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

راستہ سے مراد راہ، سڑک، گزرگاہ، روڈ، رسم، رواج، قاعدہ، دستور، ڈھنگ، طریقہ وغیرہ ہیں۔ راہ کا جمع راہیں جبکہ راستہ کا جمع راستے ہیں۔ رستہ، راستہ کا مخفف ہے۔ راستہ فقط ایک راہ ہی نہیں ہے بلکہ راہبر، راہنما، راہ پیما، راہِ خدا، راہدار، راہ راست، راہ رسم، راہ رو، راہ روِش، راہ ریت، راہزن، راہ گزر، راہ گیر، راہ نامہ، راہِ نجات، راہ مار جیسے غیر معمولی اور معنی خیز اصطلاحات کا منبع بھی ہے۔

چنانچہ سڑک یا روڈ دونوں راہ یا راستہ کے مترادفات ہیں۔ سڑک سے مُراد شارِع یعنی کہ بڑا راستہ ہے۔ شارع عام کا مطلب ہے عام راستہ یعنی کہ وہ لمبی چوڑی سڑک جس پر ہر کسی کو چلنے کا حق ہوتا ہے۔ شاہ راہ بڑا راستہ ہوتا ہے جسے لوگ جرنیلی سڑک کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ کبھی کبھی حکام

اورعوام اسے نہ صرف قومی شاہ رابلکہ اس کی اہمیت کے سبب ملک کے لئے شاہ رگ قرار دیتے ہیں۔ان بڑے راستوں کو سرکار آہستہ آہستہ سیکولر رنگ میں یادگاری اثاثے قرار دے رہی ہے۔مثال کے طور پر تھوی راج، روڈ مغل روڈ، مولانا آزاد روڈ، اورنگ زیب روڈ، امرت شیبل مرگ روڈ، اندرا گاندھی روڈ وغیرہ۔

دنیا میں بنی نوع انسان کی زندگی مرتے دم تک رواں دواں رہتی ہے۔ اس کے چلنے پھرنے اور دور دراز علاقوں میں آنے جانے کے لئے راہیں یا راستے ہونا بہت ضروری ہے۔قدیم وقتوں میں لوگ کھیتوں اور میدانوں میں سے پیدل چل کر تنگ راستے بناتے تھے جو پگ ڈنڈیاں کہلاتی تھیں۔ زمانے نے پلٹا کیا کھایا کہ ان میں بعض راستے آناً فاناً، سڑکوں میں بدل گئے اور پھر ان میں سے اِکا دکا سڑکیں شاہ راہیں بنا دی گئیں۔ہوائی، سمندری اور دریائی راستے زیادہ تر ہواؤں کے تابع ہوتے ہیں۔ہواؤں کا رخ دیکھ کر پائیلٹ یا جہاز راں یا ملاح اپنے اپنے راستے بھانپ لیتے ہیں۔ریلوے کے راستوں پر پٹریاں بچھادی جاتی ہیں۔ریل گاڑی میں سفر کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہت ہی لمبے سیدھے راستے پر کہیں جا رہے ہیں۔ویسے بھی ٹیڑھا چلنا دہرے تہرے نقصان کا متقاضی ہوسکتا ہے۔سیدھی راہ اختیار کرنے کے حق میں یہ مصرعہ ملاحظہ کریں۔

راہِ راست برو اگر چہ دور است

فی الحقیقت بنی نوع انسان کی دنیاوی زندگی مسافرت میں گزرتی ہے۔اس کے لئے منزل بہ منزل چلنے پھرنے کے راستے یا تو مقرر ہیں یا وہ اپنی فہم وادراک سے وقتاً فوقتاً اپنے مفاد کی منزل گاہوں تک پہنچنے کے لئے راستوں کا پتا لگاتا ہے، تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی نے کسی نئی جگہ یا منزل کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے گوگل میپ کی خدمات میسر کر رکھی ہیں۔اس خصوصی سہولت کی بدولت کوئی بھی انسان جس کے پاس موبائیل ہو، راستہ بھٹکنے سے بچ سکتا ہے۔علاوہ ازیں کبھی کبھی ہم کسی نامعلوم مقام تک پہنچنے یا کسی جانے پہچانے یا انجانے شخص کا پتا نکالنے کے لئے بعض راستوں پر قائم یادگاروں کا سہارا لیتے ہیں، مثال کے طور عید گاہ روڈ، جامع مسجد روڈ، حضرت بل سڑک، اِندرا گاندھی روڈ، مغل روڈ، وغیرہ۔

ایک انسان کو کسی بھی دنیاوی یا اُخروی حصول مقصد کے لئے راہیں تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ اس قسم کی جدوجہد میں کامیاب لوگوں کی طرف سے اختیار کئے گئے راستے پر چلنا اس کی اپنی صواب دید ہے۔شومی بخت یہ ہے کہ منفی سوچ رکھنے والے لوگ یا تو راہِ راست سے بھٹکتے ہیں یا بے راہ ہو جاتے ہیں یا پھر راہ فرار اختیار کرنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کے دنیا میں آنے اور پھر دنیا

سے چلے جانے، غرض دونوں کی راہ داری کا پروانہ جاری کرنے کا علم خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کائینات کی ہر کسی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا بچہ شروع میں فقط آدم زاد یا آدم زادی کی صورت میں راہِ انسانی اختیار کرتا ہے جبکہ بالآخر دنیا سے رخصتی کے مختلف راستوں سے واپس جاتا ہے۔ گویا پھر یہ راہ روانِ ملکِ عدم یا تو قبرستان میں دفن ہو جاتے ہیں یا شمشان گھاٹ میں الاؤ کے شعلوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ دنیا میں ہر مذہب کے ماننے والے لوگ اپنے اپنے راستوں سے مخصوص جگہوں پر آنے جانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسی راہوں کے نام ان کی زبان پر ہوتے ہیں۔ راستہ چاہیئے مسجد کو یا مندر کو یا گوردوارے یا چرچ تک جاتا ہو۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ان عبادت گاہوں میں یکجا ہونے والے لوگ الگ الگ سوچیں رکھتے ہیں اور پھر راہ کترا کر نکل جانے لگتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگوں کا علم ان کے سروں پر چڑھ کر اپنے اسلاف کی ہرزہ سرائی کرنے کو ہوا دیتا ہے حالانکہ جن راستوں پر وہ (اسلاف) گامزن تھے وہ حال کے راستوں سے بھلے معلوم ہوتے ہیں

چنانچہ جس طرح کسی نوجوان جوڑی کی محبت کے لمبے راستے پر لومیرج منزلِ مقصود ہوتی ہے بالکل ویسے ہی انداز میں بہت سارے طلاب

حصولِ تعلیم کا سفری راستہ لمبا ہونے کے سبب قلیل مسافتی کورسز پاس کرنے سے منزلِ مقصود کو پہنچتے ہیں۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ آج کل کا سوشل میڈیا یا تو نوجوانوں کو راہِ راست پر لانے کی ترغیب دیتا ہے یا پھر ان کو راستہ بھٹکنے کی پٹی پڑھاتا ہے۔ یہ والدین ہی ہیں جو اپنے بچوں کو ہر وقت صحیح راستہ دکھانے کی تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔ تاہم موبائل ایک ایسی چیز ہے کہ جس نے گویا اپنی کشش مقناطیسی سے بچوں، نوجوانوں اور بزرگوں کی ہمہ وقت مصروفیات مُستعار لی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض گنے چنے افراد اِس راہ کو کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہوتے ہیں جبکہ خواتین کی اکثریت اس رستے کو کاٹ کے ہی رکھتی ہے جبکہ سیاست داں، حکمران اور مذہبی لیڈراں بھی اپنے خطابات سے عوام الناس خاص کر انجان لوگوں کو راہ سے بے راہ ہونے کی نوبت تک پہنچا دیتے ہیں۔ دراصل دنیا میں سیاست دان عوام کو راضی رکھنے کے لئے طرح طرح کی راہیں کھُلنے کی اُمید لگائے رکھتے ہیں۔ کسی نے پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ''منزل تو ملے گی بھٹک کر ہی سہی، گمراہ تو وہ ہیں جو گھر سے نکلے ہی نہیں۔ کوئی سفر بھی لاحاصل نہیں ہوتا، منزل نہ بھی ملے تو راستے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں''۔

نمک اور شکر

نمک سے مراد نون، کھاری پن، سانولا پن، ملاحت، سلونی چیز کا ذائقہ، شوخیِ کلام کا لطف، روزینہ، تنخواہ وغیرہ ہیں۔ الغرض یہ ایک ٹھوس کھاری ذائقے دار چیز ہے جس کا سفوف کھانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ شکر انگریزی لفظ شوگر کا ترجمہ ہے جس کی معانی کھانڈ، چینی، بورا وغیرہ ہیں۔ خورونوش کی اکثر چیزوں میں حسبِ ضرورت نمک اور تھوڑی بہت چیزوں میں سفید شکر ملانے سے ضیافتیں یا نعمتیں نہ صرف خوش ذائقہ بلکہ مزے دار بن جاتی ہیں۔ انگریزی زبان کا ایک مقولہ ہے کسی چیز کا اِزدیاد بُرا ہوتا ہے۔ فی الحقیقت ہماری زندگی ہر ساعت مزے میں نہیں گزرتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معمول کی زندگی کے دوران کسی سوچویشن کے سبب مزے میں آنا بھی مہنگا پڑتا ہے۔

حکمتِ خداوندی دیکھیں کہ ہر کمالے راز والے کی مِثل بعض لوگوں کے لئے لذیذ نمکین ضیافت ہائی بلڈ پریشر کا باعث بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ کسی بھی سالن میں نمک تیز یا برابر ہونے سے ایسے روگیوں کا بلڈ پریشر

بڑھ سکتا ہے جن کو یہ عارضہ پہلے ہی لاحق ہوا ہو۔اور ہاں! دوسری طرف سفید شکر کی میٹھی میٹھی ضیافتیں تناول کرنے سے بعض بدنصیب حضرات پرنزلہ گرنا شُروع ہو جاتا ہے یعنی کہ وہ پرائے روگ کی بلا لینے کے بجائے شُوگر سے شُوگر ہی کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس پر یوں مان لیں، سونے پہ سُہاگا یہ کہ، شُوگر کی بیماری میں پہلے سے مبتلا ہوئے مریضوں کو میٹھی چیزیں کھانے سے شوگر لیول بڑھ جاتی ہے۔قدیم زمانے میں ہائی بلڈ پریشر اور شُوگر کی بیماریوں نے اگرچہ لوگوں پر اتنی جارحیت سے اپنا جال پھینکنے سے کچھ حد تک احتراز کیا تھا لیکن اب طرح طرح کے ذرائع وافر مقدار میں دست یاب ہونے اور نمکین کے ساتھ ساتھ کھٹی میٹھی کھانے پینے کی چیزیں جگہ جگہ دکھائی دینے پر بچہ سے لے کر بوڑھے تک کو مُنہ میں پانی بھر آنے لگتا ہے۔اکثر محفلوں میں احقر نے کئی زیرک حضرات کو فتوے دیتے سُنا ہے ”مانا کہ پرہیز سب سے اچھا نسخہ ہے، مہینے میں ایک بار کھٹا میٹھا یا نمکین چیز کا لطف اُٹھانا چاہیئے“۔

بہر حال نمک اور شکر کی صورتِ حال آج جس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے اس سے لگتا ہے کہ معالجین اور اطباء اِن دشمن جاں اشیاء کو بہشت کے پھل دار درخت کی طرح شجر ممنوعہ قرار دے چکے ہیں۔میرے خیال میں اس کے لیئے کوئی آسان ترکیب نکالنے کی ضرورت ہے ورنہ نمک اور شکر

کے اجزاء کا بالواسطہ طور غیر معروف چیزوں اور انسانی جسم میں موجود ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں۔

ایک عمدہ قول ہے، ایک انسان، چاہیئے خورد و نوش کی کوئی بھی چیز ہو، کم کھائے غم نہ کھائے۔ فارسی زبان کا ایک شعر ہے۔

چو کم خوردن طبیعت شد کسے را
جو سختی پیش آید سہل گیرد

اسی تناظر میں نمک اور شکر حسبِ ضرورت استعمال میں لانا کسی بھی صورت میں مضرِ صحت نہ ہوگا تاہم جہاں چاہ، وہاں راہ۔

جہاں سرکاری ملازمین عوامی حکومت کے نمک خوار ہوتے ہیں۔ وہاں دیگر کرم چاری، خادماں وغیرہ اپنے اپنے مالکان کے نمک خوار ہوتے ہیں۔ انسانیت اور تمام مذاہب فقط اِس اصول کی تعلیم دیتے ہیں کہ نمک خواری کے فرائض ایمانداری اور تن دہی سے انجام دیئے جائیں تاکہ خدمت خلق اور دیگر نوعیت کی خدمت گزاری بجالانے سے نمک کا حق ادا کیا جاسکے۔ جہاں تک نمک حلالی یا نمک حرامی کا تعلق ہے، اس ضمن میں اتنا کچھ کہنا مناسب ہے کہ ایک انسان کو سعادت یا شقاوت ازل سے ہی ودیعت ہوتی ہے۔ پس ایسے کسی بھی انسان کا حلال یا نمک حرام ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

دنیا کے ممالک میں ناشتا کرنے کا طریقہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اکثر جگہوں پر لوگ صبح کے وقت میٹھی چیزوں سے جبکہ بعض جگہوں پر کچھ لوگ خاص کر دیہات میں نون چائے یعنی نمکین چائے کے ساتھ روٹی یا چپاتی یا پھُلکا سے پیٹ بھرنے تک ناشتا کرتے ہیں۔ کشمیری لوگوں خاص کر دیہاتیوں کو نون چائے پینے کا اتنا نشہ ہوتا ہے کہ وہ گھر سے باہر کسی دور ملک کے سفر کے دوران اِس قسم کی چیزیں اپنے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ میٹھی چائے پینے کے عادی لوگوں میں سے جو شُوگر مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ کسی دفتر میں یا اپنے کسی رشتہ دار کے گھر میں شکر یا کھانڈ کے بغیر چائے تو طلب کرتے ہیں لیکن مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ مجھے ایسے حضرات بھی دیکھنے کو ملے جو بغیر شکر یا چینی کے، چائے کی چُسکیاں کیک کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے ساتھ لیتے ہیں۔

جب ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ زندگی حباب ہے پھر اس کا دوبھر ہونا کیوں؟ آخر زندگی زندہ دلی کا نام ہے، مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔ دنیاوی زندگی کی گزر بسر کے دوران ہم اکثر مٹھاس بانٹنے کے بجائے ایک دوسرے کے برتن میں کھانے کے بعد چھید ڈالتے ہیں۔ نمک کی زیادتی کسی بھی قسم کی سالن کو زہر بنا سکتی ہے۔ اس کے برعکس شکر خورے کو خدا شکر ہی دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں شکر خورے کو شکر، موذی کو ٹکر۔

نمک چکھنے کی رسم زیادہ تر دعوتوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ضیافتیں تیار کرنے کے دوران باورچیوں کو نمک برابر یا تیز ہونے کی صورت میں ان کو مالکان سمیت مذلت و مذمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مہمان بھی نمک کے غیر مناسب استعمال سے ضیافتوں کی بے لطفی اور بد مزگی پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ حسرت کا مقام ہے کہ ایک مختصر وقت کے لئے ہم نمکینی ذائقے دار ضیافتوں کے لیے فکر مند تو رہ جاتے ہیں لیکن سکرات الموت کا مزہ چکھنے کے لئے فکر میں کھل جانے سے گریز پا کیوں ہو جاتے ہیں؟

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ نمک کی جلوہ گری کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے جتنا کہ شکر یعنی کہ کھانڈ یا چینی کا ہے۔ آج کل بازار میں مٹھائیوں کے علاوہ بھی شکر ملائی ہوئی رنگ برنگ اقسام کی چیزیں ہیں جو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ قدرت نے بھی بعض زمین دوز چیزوں اور میوؤں میں مٹھاس والی لذت پیدا کر رکھی ہے۔ شکر کی متذکرہ نعمتوں کے باوجود بنی نوع انسان میٹھے کے بجائے کھٹے یا کڑوے کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ میٹھی میٹھی چیزیں آہستہ آہستہ دانتوں کی خرابیاں بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ جس کے لیے ہمارے اسلاف نے دردِ دنداں، اخراجِ دنداں کا فارمولا وراثت میں چھوڑا ہے۔ لہٰذا میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو کا زمانہ گزرنے کے ساتھ ہی انسانوں نے حفظ جان کے لئے میٹھے کے بجائے نمکین سے اُنس بڑھانا شروع کیا ہے۔

نمک یعنی کہ نون اور شکر یا چینی کے اپنے اپنے مستعمل ہونے کے علاوہ اور بھی کچھ فنکشنز میں جن کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ شادی بیاہ کے موقعوں پر میکے اور سسرال والوں کے مابین لڈو، پیڑا، جلیبی، کیک وغیرہ ایک دوسرے کے گھر لانے لے جانے اور مٹھائی سے منہ بھر دینے کے علاوہ تقسیم ہونے کی چھوٹی چھوٹی رسمیں نبھائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانے میں نبات سے بنے مٹکوں کو ایک دوسرے کے گھر لانے لے جانے کی رسم رائج تھی۔ شادی بیاہ کی ایک اور رسم نبات چنوانا تھی جس کے تحت دلہن کے ہاتھوں، کہنیوں، کندھوں اور گھٹنوں پر مصری کی ڈلی رکھ کر دلہا کو منہ سے اٹھوا کر کھلانا۔ اگر میکے جا کر دلہن کی واپسی میں تاخیر ہو جاتی تھی تو سسرال والے نمک لینے کی رسم انجام دیتے تھے۔ گویا آپ نے جو تاضیر کی اس سے ہمیں بدمزگی پیدا ہو گئی۔ اس کے علاوہ حیوانات کو گھاس چرنے کی رغبت پیدا کرنے کے لئے نمک کھلایا جاتا ہے۔ گلے کی خراش کے دوران غرغرہ کرنے میں نمکین پانی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال نمک کا سفوف ہو یا مصری کی ڈلی دونوں کی زیادتی مضرِ صحت ہوتی ہے۔ تاہم انسانوں کی توجہ اب حسبِ ضرورت نمک ڈالی گئیں چیزوں جن میں پکوڑے سرِفہرست ہیں، کی طرف ہو گئی ہے۔

خانہ داری

جس طرح ریاستی ملکی نظام جمہوریہ میں بلدیہ اور پنچایتی راج کے لئے نچلی سطح کی دو الگ الگ اکائیاں مقرر ہیں، بالکل اسی ڈھنگ سے دنیاداری کے وسیع نظامِ فطرت میں خانہ داری نچلی سطح کی ایک ایسی اکائی ہے جس سے انسانوں کی دنیا کا چلن سے چلنا ممکن ہو جاتا ہے۔ حکومت جمہوری اور خانہ داری میں صرف اتنا فرق ہے کہ اولوالذکر کے تحت انتخابی عمل کا طریق اپنانا پڑتا ہے جبکہ آخرالزکر کے فطری جنجال میں واجب الاتباع شخص کو پھنسے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ دنیاداری کے وسیع منظرنامے میں خانہ داری کو خودارادیت کا ایک ایسا نظام فرمان روائی مل گیا ہے کہ جس کے دوران خانہ دار کو خانگی امور کی باگ دوڑ سنبھالتے ہوئے گھرباری کے امتحان میں سرخرو ہو کر نکلنا ہوتا ہے۔ جس سے بارِ عیال، کار ابدال کے اصول پر چلنے کو حوصلہ اور ہمت ملنا مراد ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خانہ داری چلانے والا فرد جو عموماً گھر میں بڑا مانا جاتا ہے، کا حکم گھر کے تمام افراد کے لئے واجب الادعان ہوتا ہے۔ جہاں تک خانہ داری اقتدار کی منتقلی کا تعلق ہے اس میں فطری عمل بھی ہے اور دنیاوی

حکومتوں کے مشابہ ہنگامی صورتحال سے نپٹنے کا لائحہ عمل بھی۔عمومی طور خانہ داری چلانے میں بیوی میاں کا بھرپور ساتھ دیتی ہے گویا گھر کے معاملات بہ احسن وخوبی انجام دینے کی خاطر خانہ داری کا عنان اقتدار سنبھالنا دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی ہے۔کہیں کہیں دیکھنے میں آیا ہے کہ خانہ داری کی ذمہ داریاں نبھانے کے دوران میاں بیوی کی مشاورت میں اکبر بیربل کی صدائے بازگشت کا گمان ہونے لگتا ہے۔یوں تو خانہ داری کا نفاذ پورے عالم کون وفساد پر محیط ہے لیکن کبھی کبھی کسی مشترکہ فیملی کا ذیلی تقسیم میں بکھرنے سے گھر گھر راج نافذ ہو جاتا ہے۔

جہاں ہنگامی صورت حال کے پیش نظر سیاسی حکمرانی کے متبادل آمریت نافذ کرنے کی مجبوری آن پڑتی ہے۔وہاں خانہ داری کی قرابت قریبہ کے سبب گھر کے کسی دوسرے فرد کو ڈکٹیٹر کے منصب پر کھڑا کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔فی الحقیقت خانہ داری کو کسی لگی لپٹی کے سوا چلانا ایک منجھے ہوئے خانہ دار کی متوازن سوجھ بوجھ پر منحصر ہوتا ہے،اگر صورت حال اس کے برعکس ہوگئی تو بٹوارہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

خانہ داری کو بے تاج بادشاہی تصور کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

حالانکہ گھر کے گورکھ دھندوں میں میاں بیوی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے افراد کنبہ کا شریک رہنا لازمی ہوتا ہے تاکہ گھر کے داخلی اور خارجی امور کی انجام

دہی میں کسی قسم کی بے اعتنائی وقوع پذیر نہ ہو۔خانہ داری کے معاملات میں صلہ رحمی سرِفہرست ہوتی ہے، مگر زمانے کا دستور ہے کہ جب کسی گھر میں دلہن آتی ہے تو فیملی میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو جاتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی رشتہ داریاں بڑھ جاتی ہیں جن کو ایک خاص مدت میں اہلاً وسہلاً مرحبا سے نوازا جاتا ہے۔اس لئے قرابتی قرابت سے آنکھیں پھر جانے والے لوگ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ نئے جب یار ملتے ہیں تو پرانے بھول جاتے ہیں۔

خانہ داری کے دائرہ اختیار میں زندگی کے تمام اہم مراحل آتے ہیں جن کو طے کرنے کے لئے ابتدائی تربیت گاہ کا کام خانہ داری سے لیا جاتا ہے بشرطیکہ خانہ دار اور اس کی بیوی کو گھر کے سبھی افراد پر دسترس حاصل ہو۔جتنی زیادہ وہ چھوٹوں پر دستِ شفقت رکھتے ہوں اتنا ہی زیادہ ان کے چھوٹے بڑے منصوبے کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔اس حقیقت سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ سالہا سال سے چلائی جارہی رسوماتِ بد کے خلاف تحریک اس لئے زیادہ بار آور ثابت نہ ہوسکی کیونکہ خانہ داری کے ساجھی بیوی نے فرسودہ رسم و رواج سے چھٹکارا پانے کی تحریک کا ساتھ نہ دیا۔جس میں اسے گھر کی جملہ عورت ذات کی حمایت بھی شامل تھی۔الغرض خانگی نظام چلانے کے دوران بعض گھرانوں میں مردوں کی اکثریت بیوی کا غلام بن کر رہ جاتی ہے۔البتہ کہیں کہیں پر ''بیوی نیک بخت، دمڑی کی

دال تین وقت'' کے مصداق گھر میں فضول خرچیاں نہیں ہوتی ہیں۔

سچ ہے کہ وقت نہیں رہتا، بات رہ جاتی ہے۔ ایک زمانے میں تحصیل دار، حلقہ دار، ذیل دار اور لمبر دار چاروں اپنے دم خم سے وقت کے بڑے درباری مانے جاتے تھے۔ دنیا داری کی اور بھی کئی متوازی نظام ہیں جن میں جاگیر داری چک داری اور تحویل داری قابل ذکر ہیں۔ الغرض دنیا میں سرکاری اور نجی دونوں سطحوں پر مختلف النوع منصب داریاں کہیں پرانے ناموں سے کہیں نام بدل کر دنیا داری کے چلنے چلانے میں اپنا اپنا رول نبھا رہی ہیں، صرف ایک خانہ داری ہے جسے زبردست چیلنجوں کے باوجود کسی قسم کے تغیر و تبدل سے نبرد آزما نہ ہونا پڑا ہے۔ اگر پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھیں تو تحصیل داری اور لمبر داری دونوں کے لئے ایک ہی ذمہ داری مشترکہ تھی اور وہ تھی مال گزاری وصول کرنے اور خزانے میں ڈالنے کی ذمہ داری۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خانہ داری کے معاملات پر زیادہ تر نگاہ بیگم یعنی کہ بیوی کی رہتی ہے کیونکہ خانہ دار اکثر گھر سے باہر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ دنیا داری میں اب نئی نسل کے جوڑے دونوں میاں بیوی ملازمت پیشہ ہونے کے سبب عموماً گھر سے باہر ہی ہوتے ہیں، اس لئے خانگی کے اہم معاملات پر کوئی بھی فرد

بریفنگ دینے کے لئے دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح سے ان کی خانہ داری خارجی اور داخلی امور کی بے اعتنائی کا شکار ہو جاتی ہے۔

خانہ داری چلانے کے دوران خانہ دار چاہیئے کوئی بھی ہو اس کو بہت سارے مراعات حاصل ہوتے ہیں۔ باورچی خانے میں اس کے کھانے پینے کے لئے خاص برتن ہوتے ہیں۔ چاولوں کے ساتھ خاص سالن کے علاوہ پکائے گئے گوشت کے معمول سے زائد ایک یا دو ٹکڑے اس کے تناول فرمانے کے لئے مختص ہوتے ہیں۔ اس کے خوبصورت کمرے میں خاص بستر لگانے اور اٹھانے کے کام کو گھر کی خواتین انجام دیتی ہیں۔

زمانہ قدیم میں خانہ داری چلانے والوں کو پیتل کے خوبصورت سماواروں میں صبح وشام کی چائے پیشِ خدمت کی جاتی تھی۔ باہر کی دنیا کی دعوتوں پر خانہ دار کو مدعو کرنے کا رواج آج بھی چل رہا ہے۔ بیٹا بیٹی کے سسرال میں بھی ایک خانہ دار کی مہمان خصوصی کے طور آو بھگت ہوتی ہے۔

ایک مہذب معاشرہ کی تشکیل پانے کی سنگ بنیاد ڈالنے کا سہرا مثالی خانہ داری کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ خانہ داری کے دوران عزیز واقارب خاص کر گھر کے بڑوں کا بچوں کی شخصیت بنانے اور سیرت سنوارنے میں ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ خانگی نظام میں خانہ داری ایک ایسی لیبارٹری ہے

جو زندگی کے ہر معاملے کا تجرباتی عمل درآمد کے نمونے پیش کرتی رہتی ہے اور جن کو نہ صرف خاندان کے افراد بلکہ آس پاس کے گھرانے بھی اپنانے لگتے ہیں۔ البتہ ایک خاندان کی ناقص کارکردگیوں سے خانہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو دوسرے خاندانوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہاں اگر ذرا سی کوتاہی ہوتی ہے تو سمجھ لیں کہ گھر کے ہوئے نہ در کے۔

نام ساکھ

کسی شاعر نے کہا ہے ؎

خواہش مجھے نام کی نہیں ہے

دنیا میرے کام کی نہیں ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کون نہیں جانتا کہ جس کی ابتدا اچھی ہوتی ہے اس کی انتہا بھی اچھی ہوتی ہے۔ خالق کائنات کو مسلمان اللہ کے اسم ذات سے جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں جبکہ رام رحیم کی اِصطلاح دو دھرموں ہندومت اور دین اسلام کے ماننے والوں میں مرّوج ہیں۔ ہندو لوگ خدا کو بھگوان کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بہت سارے صفاتی نام بھی ہیں ان ناموں کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہو جاتا ہے جب ایک مسلمان خدا کے حضور عاجزی سے رقت انگیز انداز میں ذِکر خدا کرنے لگتا ہے۔ اس کی زبان پر یا اللہ، یا رحمٰن یا رحیم، یا ملِکُ یا غفار وغیرہ صفاتی ناموں کی گونج اُٹھنے سے ارد گرد کے ماحول میں ایک غیر معمولی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو خود واجب الوجود ہے اور اس عالم

وجود میں ذرہ ذرہ اسی کا بنایا ہوا ہے لہٰذا وہ اپنی مرضی سے ذرے کو چمکا کر آفتاب کا نام دیتا ہے۔ اپنی تخلیقات پر جب رب کائنات نے فرشتوں سے سوال کیا وہ کسی دنیاوی چیز کا نام بتا نہ سکے۔ جب کہ آدم خاکی نے جھٹ پٹ جواب دیا۔ اس پر ملائکہ سے خدا نے فرمایا" کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو"۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے اور بھی صفاتی نام ہیں جن میں جلالی اسماء جیسے قہار، جبار اور جمالی جیسے رحمٰن و رحیم وغیرہ ہیں۔ اسماءِ با مسمی کے زمرے میں ایسے موجودات بھی آتے ہیں جن کی صفات ان کے ناموں سے مماثلت رکھتی ہیں۔

وعدہ جو کیا وصل کا آئے وہ پئے قتل

ہے حسن کے مشرب میں وفا نام جفا کا

اِس حقیقت کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہر جاندار اور بے جان موجودات کے نام نہ ہوتے تو غیر منقوط حروف تہجی کے مُتشابہ بے نام و نشان موجودات کی پہچان کرنے کا ڈھنگ رائج الوقت ہوتا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اسم وہ کلمہ ہے جس سے کسی شخص، جانور، جگہ یا چیز کا نام مراد ہوتا ہے۔ دنیا میں انسانوں، جانوروں، جگہوں یا چیزوں کے نام ہوتے ہیں۔ کس کا کیا کام ہوتا ہے یا کون کِس کام آتا ہے اس کام کا بھی ایک نام ہوتا ہے گویا ہر نام کے ساتھ کام دھندے کا ہونا لازم و ملزوم ہے۔ زہے نصیب!

بہت سارے انسان دنیا میں اپنے نام یا اپنے دھندے کے نام کی بدولت نمایاں کارنامے انجام دیتے ہیں اور ان کی نام آوری دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ جیسا بھی ہو، نام پراپرائٹر کا ہی آسمان پر ہوتا ہے۔ کارخانے داروں میں سے بھی وہ لوگ خوش بخت ہوتے ہیں جن کی مصنوعات پر گاہکوں کی نظریں اٹکتی ہیں اور نتیجہ کے طور ایسی اشیاء رجسٹرڈ ٹریڈ مارکہ کہلاتی ہیں۔ اگر ہم بغور مشاہدہ کریں گاہکوں کی دنیا میں کارخانے داروں سے زیادہ رجسٹرڈ مارکہ مصنوعات کے ناموں کے چرچے پھیلے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض کارخانے داروں اور تاجروں کی شومی طالع سے ان کے حصے میں بدنامی آتی ہے چونکہ بنی آدم کو اس کارگاہ ہستی میں زندگی گزارنے کے دوران کسی بھی کام میں لوگوں کے دل جیتنے کی صورت میں نیک نامی نصیب ہوتی ہے جبکہ دوسرے انسان کو اپنے کرتوتوں کے باعث بدنامی قسمت میں ہوتی ہے۔ داناؤں کا قول ہے نام بڑا یا دام، سچائی تو یہ ہے کہ نیک نامی کا واسطہ براہ راست انسانی کردار کے ساتھ ہوتا ہے جو ایک مستحسن شگون ہے۔ اسی لئے نیک نامی کا ایک لمحہ مال و دولت اور عالیشان بنگلوں سے کئی گنا بہتر ہے۔ چنانچہ آدمی کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے لیکن وہ آدمی ہی کیا جو آدمی کو نہ پہچانے، حیاتی میں اس کی قدر نہ کرے جبکہ بزرگوں کے مطابق آدمی کی دوا آدمی ہی ہوتا

ہے۔ دنیا میں اچھے انسانوں کے نام باقی رہنے کے طریق کار میں زمانے کی ہوا بگڑنے سے رخنہ پڑتا ہے۔ اسلاف کی طرف سے وراثت میں ملے بہت سارے نام اور کام آج بھی زبانِ زد خاص و عام ہیں۔ حاتم طائی کی سخاوت، عدلِ فاروق اعظمؓ اور سلطان سکندر بُت شکن جیسے ناموں کا چرچا آج بھی ہوتا رہتا ہے۔

عالم تصور میں ہر ایک انسان اپنا نام نکل جانے کی راہیں تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ سیاست دان اور فنکار لوگ اپنے اپنے نصب العین کی عملی صورت اختیار کرنے میں طرح طرح کی چھل بل آزماتے ہیں کیونکہ کون نہیں جانتا کہ دنیا میں نام باقی رہنے کی حد مدت زیادہ سے زیادہ چار پیڑھیوں تک ہونا قرین قیاس ہوتا ہے۔ اگرچہ اسی پر تکیہ لگا کر بیٹھنا نادانی ہے لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ ”کل کس نے دیکھا کہ کس کے یہاں سے جانے کے بعد دنیا و مافیہا میں کیا ہوتا رہا ہے“۔ اس نوعیت کی حسرتیں نکلنے کی کیا گارنٹی دی جا سکتی ہے جبکہ اس کے لیے محاسبہ لینے تک کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہوتی ہے۔ یوں بھی ہم روز مرہ گفتگو کے دوران کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی کہتے رہتے ہیں کہ اس عالم فانی میں اگر کچھ باقی رہے گا تو وہ ہے خدا کا نام! تاہم علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں دنیاوی لحاظ سے ایک تاریخی

منظر نامے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشان ہمارا

انسانوں کے نام وجہ تسمیہ کے تابع ہوتے ہیں بصورتِ دیگر مہملات قرار دیئیے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم علم صرف ونحو کے مطابق اسمِ یا نام کی تعریف کرنے بیٹھیں تو یہ وہ کلمہ ہے جو اپنے آپ معنی بتائے اور کوئی زمانہ اس میں نہ پایا جائے، چنانچہ بعض حضرات اللہ کو خدا کا اسمِ اعظم قرار دیتے ہیں جبکہ یہ اسم ذات بھی ہے جو کنایتہً اس کی ذات پر دلالت کرتا ہے۔

جب سے ہوا ہے عشق تیرے اسم ذات کا
آنکھوں میں پھر رہا ہے مرقع نجات کا

جب سے آنکھ کھولی تمام جاندار اور بے جان موجودات ظاہری و خارجی کے نام ماں بولی سے سننے شروع ہو گئے اور یہ عمل بقولِ کسے مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے۔ البتہ انسانی ناموں کے ساتھ ذات، لقب، کنیت، خطاب اور عرف وغیرہ بھی مناسبت رکھتے ہیں۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں مجھے ایک عجیب وغریب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اس طرح کہ اپنے ہی گاؤں کے ایک پڑوسی زمیندار نے پٹواری سے حاصل کئے گئے۔ دو کاغذات انتخاب گرداوری اور انتخاب جمعبندی

جوکہ اس کے ذاتی رقبہ اراضی سے متعلق تھے، مجھے پڑھنے کے لئے ہاتھ میں تھما دئے تاکہ میں اس کے اطمینان کے لئے کاغذی اندراجات کی وضاحت کروں۔ان پر نگاہ ڈالتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے جب میں نے ناموں کے اندراج میں غلام محمد ولد محمد مقبول نام کے بجائے "غمہ ولد مغہ" اور سلیمہ بیگم بیوہ ثنااللہ کے بجائے "سلیمہ بیوہ سونہ" لکھا ہوا پایا وقس علیٰ ہٰذا خدا بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لینڈ ریکارڈ میں عام لوگوں کے نام کیوں مخفف صورت میں مضحکہ خیز بنا دئے گئے ہیں۔تاہم برہمنوں اور سادات خاص کر بیہقی سادات کے ناموں کی سالمیت اضافی اعزازات کے ساتھ برقرار رکھی گئی ہے۔

دنیا کی ریت رسم ایسی ہے کہ بعض اوقات لوگ کسی کے نام کی تسبیح پڑھنے میں دلچسپی لیتے ہیں تو کبھی کسی کے نام یا کام سے جلنے لگتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ بہت سارے مصنفین، شاعر اور واعظین اپنے اپنے نام کی نوبت بجانے کی ہر ممکن تگ و دو کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کے ناموں کا سکہ جاری ہو۔بقول شاعر۔

دل میں رہتے ہو مگر نام سے جلتے ہو میرے
جانِ من ہے محبت میں عداوت کیسی

نام سے کبھی کبھی بڑے بڑے کام نکلتے ہیں اور کسی کام کے نام سے نام

پڑ جاتا ہے جو پھر آہستہ آہستہ مستقل نام آوری کا باعث ہوتا ہے۔ ہمارے سماج میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں ایک بیٹا ڈاکٹر یا وکیل بن کر اپنے گھر کے گیٹ پر اپنے نام کی نیم پلیٹ آویزاں رکھتا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اِسی کے آدھار پر دوستوں کے دعوتی رقعے بھی بیٹے کے ہی نام آتے ہیں اس قسم کی بھیانک صورت حال سے گھر کے مالک عموماً والد کی حیاتی مخدوش ہو جاتی ہے۔ خنزیر اور شیطان دراصل جنگلی سور اور ابلیس کے دو ایسے نام ہیں جو اکثر انسانوں کی صورت میں روپ دکھاتے ہیں۔ اگرچہ کسی کو خنزیر کہنا اسلام اور انسانیت کے سراسر منافی ہے لیکن بازاری لوگوں کی زبانیں اکثر کسی کو شیطان تو کسی کو خنزیر نام لینے سے باز نہیں آتی ہیں۔

دنیا میں بہت ساری چیزیں یادگار زمانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ آثار قدیمہ یا آثار متبرکہ کے محفوظ ہونے کی بدولت کئی نام جاننے یا دہرانے میں ہمیں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے گھروں میں کبھی کبھی کئی ایسے ناموں کا ذکر ہوتا ہے جن کا ابتدائے آفرینش سے آخر تک وردِ زبان ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

ہے بتوں کی یادگاری بھی خدا کی یاد بھی
اے تصور اب ہمارا دھیان پورا ہو گیا

مثالیں بھی ان گنت ہیں، شداد کی جنت، گنج قارون، جنگ جرمن،

دجال، نوشیروانِ عادل، جلیانوالاباغ، تاج محل، ہٹلر، لیلیٰ مجنون، شیرین فرہاد، اکبر بیربل، خواجہ خضر علیہ السلام، ہاری پربت، جھیل ڈل، قطب مینار، لال قلعہ، آدم کی چوٹی، عشق و عاشقی میں بھی عاشق کبھی انتظار کی گھڑیاں گنواتا ہے۔

گلی میں یار کے سب شاد مشتاق بیٹھے ہیں
خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا

کاروباری ادارے اور ورکشاپ مالکان متبرک زیارتوں کے نام ونشان باقی رہنے میں زبردست کردار ادا کرتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور تربیتی اداروں کے مالکان بھی ایسے ناموں کو روشن کرنے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب لوگوں کو بدیسی نام دینے کا کیف چڑھتا رہتا تھا لیکن اب مقامی رنگ باندھنے کا رواج رائج الوقت ہو گیا ہے۔ شاہِ ہمدان ٹرسٹ، غوثیہ ورکشاب، سلطان العارفین سکول، بڈشاہ پل، نالہ امیر خان، شیر کشمیر پارک، علمدار انڈسٹری، خالق آباد، ملہ کھاہ، للہ عارفہ سینٹر، حبہ خاتون پیرامیڈیکل انسٹچوٹ، سوچھ کرال سوسائٹی، گاندھی میموریل کالج جیسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

جب سے لوگ دور دراز کالنیوں میں رہائش پذیر ہونے لگے ہیں بعض شہروں اور دیہات کے نام غیر رائج ہو کر غیر موثر ہو گئے ہیں پھر بھی دنیا سے

گزر جانے کے بعد ایک انسان کی قبر پر لگے نشان سے اُس کے نام کی شناخت ہو جاتی ہے۔

یہ خدا کی کرشمہ سازی نہیں تو اور کیا ہے کہ جن بندوں کو وہ اولیا کا درجہ بخشتا ہے ان کے نام دنیا میں باقی رہتے ہیں اور ایسے ناموں کا چلنا کبھی بند نہ ہوگا۔ اپنے نام ساکھ کے لئے ایک انسان کیا کیا چالیں نہیں چلتا لیکن جسے اللہ عزت اور نام دے اس کا نام دنیا میں دوام پاتا ہے۔

پَروا

پرواتمام جانداروں کی زندگی کا جزولاینفک ہے۔خاص کر حفظ ما تقدم کے طور انسانوں کے لئے لایف لائن کی حیثیت رکھتا ہے۔پَروالفظ کے ہم سَر دو پَرواالفاظ میں سے ایک پُروا ہے جس کے معانی ہیں یورپ کی ہوا، بادِ مشرق اورصبا، جبکہ دوسرے پَرواکے معانی قمری مہینے کے پہلے اور دوسرے پندرھواڑے کی پہلی تاریخ اور چاند کے بڑھنے یا گھٹنے کا پہلا دن، پرواذی روح مخلوق کے اندرایک بے ساختہ فطری احساس بھی ہے اور جذبہ ارادت بھی، فکر رسا لوگ پروا سے مراد احتیاط برتنا اورتشویش میں پڑنا لیتے ہیں۔لاپرواکے بجائے بے پروالفظ استعمال میں لانے کے لئے فُصحا کا ذکرلغت میں آیا ہے۔بے پرواتو خالق کائنات ہے کیونکہ وہ صمدیت، بے نیازی اورغیرفانی ہونے کے سبب خودکسی کا محتاج نہیں ہے جبکہ ساری مخلوقات اس کی محتاج ہے۔لہٰذا اُس کا بے پرواہونا حق بجانب ہے۔لاچاری پربت سے بھاری ہوتی ہے۔بچارے آدم زادوں سے۔طوعاً وکرہاً غفلت اوربے خوفی کے سبب لاپروائی کاارتکابِ جرم ہوجاتا ہے، جس

کی بخشش کے لئے پرواکرنے کااحساس اُنہیں بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچتے پہنچتے ہونے لگتا ہے۔ پرواکے مقابلے میں ہندی زبان میں چنتا اور انگریزی زبان میں کیئر لفظ مستعمل ہے۔ پرواکامفہوم جن مترادف الفاظ سے واضح ہوجاتا ہے وہ ہیں خوف، خطر، فکر، سوچ، تردد، کھٹکا، خواہش، اندیشہ، توجہ، غرض، فکر، خیال، شوق، نگرانی جُبن، وحشت، ھراس، ھول، احتیاط، رغبت، بیم، ترس، محابا، رعب، عزم، قصد، اعتنا، التفات، اشتیاق، قصد وغیرہ۔
جس انسان کوزندگی گزارنے کے دوران کسی بھی قسم کی فکرلاحق ہوجاتی ہے۔ یاکسی خطرہ کے پیش نظر تشویش میں پڑنے کی گھڑی ہوتی ہے اس کا یکایک پریشان ہوناہی اس کی پرواکو ظاہر کرتا ہے۔کسی شاعر نے پرواکی کیاخوب منظرکشی کی ہے۔

اپنے ہوئے بیگانے تو بندی کا خدا ہے
پروا کسی کے نہیں ملنے کی ذرا ہے

ایک ماں کو پرواکادیوی کہیں تو شاید بے جانہ ہوگا۔ پرواکرنے کاہُنر ایک ماں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ ہرکوئی ماں اپنی کوکھ سے جنم دینے والی اولاد کی مہد سے لحد تک بلکہ اگر دیکھا جائے تو بڑھاپے تک پرواکرنا اپنا محبوب شغل سمجھتی ہے۔فقط انسانوں کی مائیں ہی نہیں بلکہ چرندوں پرندوں اور درندوں کی مائیں بھی اپنے بچوں کی پرواکرنے میں کوئی کسر

اُٹھا نہیں رکھتی ہیں۔ جہاں ایک مرغی اپنے چوزوں کی اور ایک کُتیا اپنے پلّوں کی پرواکرنے میں اتنا چاق چوبند ہوتی ہے کہ کسی بھی مُنش یا جانور کو ان کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔

مختلف نوعیت کی مجالس میں اس بات کا چرچا اکثر ہوتا رہتا ہے کہ جب ایک رہائشی مکان میں آگ نمودار ہوئی تھی تو بھاگا بھاگ میں ماں کے سوا گھر کے باقی افراد اپنی جانیں بچانے کی فکر میں باہر آگئے تھے لیکن ماں اپنی جان کی پرواکئے بغیر آگ کے شعلوں میں اپنا ننّھا، کم سن بچہ گود میں اٹھائے باہر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد احقر نے اپنے ماضی کے تجربات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک سیکنڈری سکول کا قیام عمل میں لانے کی ٹھان لی۔ یقین جانیں کہ سکول کے لیے کوئی اچھا سا نام ٹھہرانے میں زبردست اڑچنیں آئیں، آخر کار ایک شب استخارہ کرنے کے بعد ذہن میں دفعتہً ''کیریر کیئر'' کا نام آیا اور مجھے لگا جیسے مجھے کسی نے غیب سے خبر دی ہے ورنہ یہ نام میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس الہامی نام سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ سکول میں داخلہ لینے والے بچوں کے روشن مستقبل کی تعمیر کرنے کی پرواکرنا میرا نصب العین ہونا چاہیے جو Career Care کا مفہوم بھی ہے۔ دراصل سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں معلمین اور منتظمین کا

تعلیمی صورتِ حال پر باقاعدگی سے پروا کرتے رہنا ہی طلاب کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ایسے اداروں میں لاپروائی ارتکاب جرم کے مساوی ہوتی ہے۔

اگرایک انسان زندگی کے ہر مسلے اور ہرادا پر پروا کرنے لگے تو اس کامزاج دباؤ اور پچھاوٗ کے سبب اعتدال پر رہنا ناممکن ہے۔یوں تو ہر عمل کا ضرورت سے زیادہ کرنا بھی مضر صحت ہوتا ہے اس لئے اعتدال پر رہنا باعثِ سلامتی ہے۔کبھی کوئی انسان شیطنت پر آ کر بدزبانی کرنے لگتا ہے۔ اس کو کوئی پروانہیں ہوتی ہے کہ وہ کسی کو گالیاں دے رہا ہے یا کوئی اسے گالیاں دے رہا ہے۔کوئی شخص کسی مجلس میں نصیحت آموز باتیں کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا’’میں اس چیز کی پروا نہیں کرتا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے یا محسوس کرتے ہیں۔ میرے تجزیہ کے مطابق لوگ بھی کسی چیز کی زیادہ دیر تک پروانہیں کرتے‘‘ کہتے ہیں کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب ایک انسان اس چیز کی پروانہیں کرے گا کہ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے وہ حلال سے ہے یا حرام سے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس شخص سے محبت کرنا ہر دن مرنے کے برابر ہے جسے تمہارے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔بہر حال

آج ہم اس زمانے سے گزر رہے ہیں جس کے دوران ہم کسی فرد کی جتنی پروا کرتے ہیں وہ اتنا ہی بے پروا ہو کر چلتا ہے، سچ ہے کہ محبت دعوؤں سے نہیں، پروا سے پروان چڑھتی ہے۔ یوں تو محبت کا کوئی ترازو نہیں ہوتا۔ یہ پروا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ پیار کتنا ہے۔ بقول شاعر۔

ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیتی ہے
بے پروا لوگوں سے بے پناہ محبت

سرکاری اور نجی طور عوامی خدمات پر مامور خدمت گزاروں میں نیک مقاصد کی ثمر اُمید تکمیل کے لئے پروا کرنے کا مستحکم جذبہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم غور و فکر سے کام لیں تو یہ پروا کرنے کا عمل ہی ہماری حفاظت اور سرخروئی کا ضامن ہوسکتا ہے۔ جب ہم صدق دلی سے دوسروں کی بہتری کے لئے پروا کرنے کا بوجھ اپنے سر لے لیتے ہیں تو خدا بھی ہماری خوشحالی کو یقینی بناتا ہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ عموماً غریب لوگ پروا کرنے کا عمل جوں توں کر کے اپناتے ہیں جبکہ زیادہ تر امیر لوگ لاپروا ہوتے ہیں اور ان کی پروا ان کے مال و دولت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جن خاص معاملات پر پروا کرنے کا احساس ہونا ضروری ہے ان میں سب سے پہلے بچوں کی زندگی کی طرح ڈالنے اور صحیح پرورش کرنے کا معاملہ آتا ہے۔ جب ہم کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں یا کسی بھی مشکل گھڑی میں کسی

بھی بے یارومددگار انسان کا ساتھ دیتے ہیں تو گویا ہم ایک دوسرے کی پرواکرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

سماج میں رہ کر بزرگوں، بیماروں، ارد گرد کے ماحول میں گھومنے والے چرندوں اور پرندوں کی سلامتی کی پرواکرتے رہنا ہی انسانیت ہے۔آج کل کی دنیا میں ہر کوئی آپادھاپی میں مصروف ہے، کسی کو کسی کی پروانہیں، اگر ہے تو فوجیوں کو سرحدیں بچانے کی، ایک ڈرائیور کو دوسرے ہمرائیوں کے ساتھ منزل پر پہنچنے کی، پرندوں کو اپنے بچوں کے لئے دانہ دنکا لانے اور کھلانے کی اور ایک عورت جس کے پیٹ میں بچہ ہو، کسی بھی قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں پریشان لوگوں کی ڈھارس بندھانے کے لئے محسنین ''کوئی پروانہیں'' کا راگ الاپتے ہیں۔حفظِ صحت کے لئے وقت پر پرواکرنا تیرِ بہدف ہوتا ہے کیونکہ اس سے انسان ذہنی توازن کھو بیٹھنے سے بچ جاتا ہے۔

آنکھیں

قدرت نے بنی نوع انسان کے جسم کو بلالحاظ مذہب و ملت موزون اور خوبصورت اعضاء عطا کر کے سڈول بنا دیا ہے۔ ان اعضاء میں بلب جیسی دو آنکھیں چارطرف رہنے کے لیے دی ہیں۔ چنانچہ جب ایک نوزائد بچہ اپنی ماں کے اندھیارا پیٹ کے اندر نو ماہ گزارنے کے بعد دن کے اُجالے یا رات کی سیاہی میں پیدا ہوتا ہے اس کی آنکھیں یا تو بند ہوتی ہیں یا وہ اپنی ماں یا نرس کے چہرے پر آنکھیں اِدھر اُدھر ہوتے ہی رونے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے رونے کا سبب فانی سَنسار میں نہ آنے کی چاہت ہوتی ہے۔

''آنکھ'' لفظ کی اہمیت اس کے مفہوم کے حوالے جن الفاظ سے اُجاگر ہوتی ہے وہ اس قبیل کے ہیں۔ نین، چشم، دیدہ، نظر، نگاہ، بینائی، بصارت، ایما، عشوہ، غمزہ، توجہ، شناخت، امتیاز، بصیرت، حق شناسی۔ بقول ناسخ؂

گر آنکھ ہے تو باطن انسان کی دید کر
کیا کیا طلسمہ دفن ہے مشتِ غبار میں

ایک مشہور مقولہ ہے ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'' کبھی کبھی سُنی سنائی باتوں میں اس لئے دَم نہیں ہوتا ہے کہ وہ ساری کی ساری باتیں آنکھوں دیکھی نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ آنکھوں دیکھی صورت حال بھی یکا یک بدل سکتی ہے۔ جس آسمان کے ابر آلود ہونے کی خبر آپ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی گھر والوں کو دے رہے تھے وہ آپ کے منہ کھولتے ہی صاف ہو گیا تھا۔ البتہ جو لوگ نہ سُنی اور بن دیکھی چیزیں بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ غیبی کہلاتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ مختلف نوعیت کے مقدمات اس لئے یا تو داخل دفتر ہو جاتے ہیں یا طوالت پکڑتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ حقائق جاننے کے باوجود آنکھوں دیکھا حال ذاتی مصلحتوں کے تحت بیان کرنے سے کتراتے ہیں۔

زمانے کا ورق الٹ جانے سے آنکھوں دیکھا یا دیکھی صورتحال کے لئے اب سی سی ٹی وی کیمرہ آنکھوں کے دیکھنے سے زیادہ موثر ہے کیونکہ اس میں شب وروز کی حرکات وسکنات عکس بند ہوتی ہیں۔

خدا نے بنی نوع آدم کو دنیا کا بھر پور جائزہ لینے کے لئے آنکھیں دی تھیں لیکن افسوس کہ وہ ان آنکھوں کو ایسی چیزیں دیکھنے سے ناکارہ بنا رہا ہے جو اس کے لئے ہر لحاظ سے ناقابل دید ہوتی ہیں۔ سماج کے لئے اس سے بڑا ناسور اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج کل بچے بوڑھے، جوان مرد وزن رات

دن اپنے موبائل فونوں کو آنکھوں آنکھوں میں سحر ہو جانے تک ٹکٹکی باندھنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ یہ بھی ویسا ہی ستم اور الم ہے جیسا میر تقی میر نے بیان کیا ہے۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند

فی الحقیقت یہ دنیا انسانوں کے لئے ایک تجربہ گاہ ہے جس کے اندر مشاہدہ کرنے کے لئے آنکھیں دی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ نورِ الٰہی سے مشرف ہونے کا کام بھی آنکھوں سے لیا جاتا ہے۔

تاہم آنکھوں کی پسند یا ناپسند ہونے کا عمل دل اور دماغ دونوں مشترکہ طور انجام دیتے ہیں۔ پسند اور خیال دونوں افعال انسانوں کے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا مجنون ہی جانتا تھا کہ لیلیٰ کا چہرہ کیسا تھا کیونکہ گدھا کیا جانے بسنت کی بہار۔

دیکھا دیکھی تو آنکھوں کا کام ہوتا ہے، دیکھتے ہی لوگ کسی کام کے کرنے کے لیے دیوانے بن جاتے ہیں۔ جس کسی کی نیت یا ارادہ دَھن دولت کمانے کا ہوتا ہے وہ مقابلے کی دوڑ میں ہوتی کوئی کام کرنے لگتا ہے۔ گویا اس کی آنکھیں امیری کے خواہاں ہوتی ہیں۔ حالانکہ ہمارے گھروں میں جب کوئی بچہ یا بیمار کھانے کو رغبت کی آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن بار بار منانے کے باوجود تناول نہیں کرتا تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی

آنکھیں کھانا مانگ رہی تھی، دل نہیں ۔آنکھیں پہچان بنانے کے موثر آلہ کے طور کام کرتی ہیں ۔البتہ اس میں ایک سُقم ہے کہ دونوں آنکھوں کی نظریں دماغ کے ماتحت ہوتی ہیں جو پسند یا ناپسند ہونے کا عمل دِل سے حاصل کرتا ہے ۔محبت جتانے اور اس کا دم بھرنے کا سماں باندھنے میں آنکھوں کا بہت بڑا رول ہوتا ہے ۔

الغرض اب یہ بنی نوع انسان کا کام ہے کہ وہ دنیا میں آ کر اپنی آنکھوں کا بھرپور استعمال کرے تاکہ کائنات کے باریک گوشوں کی نظارگی سے مستفید و مستفیض ہوسکے ۔کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی مگن میں دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے جب تک دنیا سے رخصت ہو جائے گا ۔حقیقت یہ ہے کہ خدا نے ہمیں سننے کے لئے دو کان اور دیکھنے کے لئے دو آنکھیں دی ہیں ۔اس کے برعکس بولنے اور سنانے کے لئے فقط ایک ہی زبان مرحمت فرمائی ہے ۔ بہرحال کائنات وسیع ہے اسے دیکھنے کے لئے آنکھ پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے ۔البتہ وقت کا کیا کریں، یہ کسی کے لئے ٹھہرتا نہیں، لہٰذا باتیں، واقعات، کہانیاں، تواریخی معلومات، ایجادات وغیرہ دوسروں کو سنانے سے زیادہ بہتر ہے ۔آنکھوں سے زیادہ سے زیادہ عجائباتِ قدرت کا نظارہ کیا جائے، دراصل خدا نے ہمیں عجائب المخلوقات کو غور سے دیکھنے کے لئے آنکھوں کی نعمت سے سرفراز کیا ہے، کاش نفس امارہ بنی نوع انسان کو

آنکھوں کی بصارت کا استعمال کرنے میں گمراہ نہ کرتا تو کسی بھی مہم میں کمال کو پہنچنا اس کے لئے ناممکن نہ ہوتا۔ اگر ایک انسان غور و فکر سے کام لے تو دنیاوی موجودات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے لئے سفر ہی وسیلہ ظفر ہے۔

بہر حال آنکھیں قدرت کا ایک انمول عطیہ ہیں جن سے عام انسانوں نے وہ کام نہیں لیے ہیں جو مجاذیب لے سکتے ہیں حالانکہ نیم شب کے دوران پُرنم آنکھیں خدا کے قریب پہنچا دیتی ہیں، پھر بھی نہ جانے ہم جیسے نافرمانوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے کے بجائے خشک کیوں ہوگئے ہیں۔ آنکھوں کی کارگزاریاں اور خوبیاں بے شمار ہیں، ان میں آنکھوں سے آنکھیں ملنا، آنکھوں سے اوجھل ہونا، آنکھ سے آنکھ لڑانا، آنکھ سے آنسو امنڈنا، آنکھیں چرا کر دیکھنا، آنکھیں پھیر لینا، آنکھوں کا تارا، آنکھوں کا نورِ چشم، آنکھ کی پتلی، آنکھ کی ٹھنڈک، آنکھ کی حیا، آنکھ مارنا، آنکھوں کا دریا بہانا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھیں فقط دیکھنے کے لئے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ آنکھوں کی بصارت یا بینائی میں سننے اور اظہار کرنے کی اِستطاعت بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک دانشمند انسان کسی بھی پریشان انسان کے چہرے کی حالت دیکھ کر فوراً بھانپ بھی لیتا ہے کہ ماجرا

کیا ہے۔ جہاں تک آنکھوں کے اشاروں کنایوں کا تعلق ہے یہ زبان کے اظہار کا کام کرتے ہیں گویا آنکھوں کے کرشمے، عشوے اور غمزے وغیرہ ظاہر کرنے کے متبادل ذرائع ہیں۔

اکثر لوگ اپنے عزیزوں بالخصوص والدین کو ان کی مفارقت کے بعد خوابوں میں دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اب یہ ان کی مثبت سوچ پر منحصر ہے کہ وہ اس نعمت خداوندی سے کس حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس انسان نے چاند کو دیکھنے کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا ہو یا موسموں کے تغیر و تبدل قبل از وقت افشا کرنے کی عقل سلیم پائی ہو، بھلا وہ اپنے آنجہانی والدین کو خوابوں میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی آرزو کیوں پورا نہیں کر سکتا۔

وہ انسان ہی کیا جسے کسی غیر محرم حسین عورت کو پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے دوران اپنے محارم میں سے اپنی ماں، بہن، بیٹیوں کی پرچھائیاں نہ پڑیں۔ ہماری آنکھیں کیا کیا نہیں دیکھتی ہیں اور کیا کیا نہیں ڈھونڈتی ہیں۔ کچھ کچھ میں، کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

سایہ

بنی آدم کے روشنی کے دوران زمین پر پڑنے والے چھاؤں یا عکس کو عام فہم زبان میں سایہ کہتے ہیں۔سایہ نہ صرف انسانوں کے ساتھ رہتا ہے بلکہ حیوانات اور پیڑ پودے وغیرہ بھی اُجالے میں سایہ افگن ہوتے ہیں۔ ایک انسان کے جسم پر مختلف قسم کی روشنیاں براہِ راست فوکس ہونے سے اس کا سایہ زمین پر پڑتا ہے گویا یہ سایہ سدا انسان کے ساتھ رہتا ہے۔شاید مومن خان مومنؔ نے بھی اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سایہ تاریکی کے سوا کھلی دھوپ اور کھلے آسمان میں، چودھویں کے چاند کی روشنی میں زمین پر عکس افگن ہو جاتا ہے۔سایہ سے مراد لغوی طور پر چھائیں، چھاؤں، پرتو، عکس، پناہ، حمایت، حفاظت، سرپرستی، صحبت کا اثر، آسیب، جن بھوت کا اثر وغیرہ ہیں۔لہٰذا سایہ کا جاندار اور بے جان چیزوں

کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہتا ہے۔

انگریزی زبان کے ایک قول کے مطابق آئندہ آنے والے حالات یا ہونے والے واقعات اپنی آمد سے قبل سایہ افگن ہو جاتے ہیں۔اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جب ایک انسان بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے اوراس کے بال سفید ہو جاتے ہیں اس کی زندگی میں بھولنا چوکنا شروع ہونے لگتا ہے۔تاہم ایسے لوگ سایہ خدا کے سہارے چاق و چوبند رہتے ہیں۔

چنانچہ گردشِ زمین سے دن رات بنتے ہیں، پھر ان کے پہروں کی روشنی میں سائے اپنی سمتیں بدلتے رہتے ہیں۔کبھی یہ بڑے ہو کر دور تک پھیلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی سمٹ کر قریب کی جگہیں گھیر لیتے ہیں۔چونکہ لوہے، سونے، پتھر یا لکڑی کی طرح سایہ کوئی ٹھوس ایٹم نہیں ہے، لہٰذا ان کی پراپرائٹر شپ کا دعویٰ کرنا شاید مناسب نہ ہوگا۔اگر گہرائی سے سوچیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ سایہ بھی انسان کی طرح پانی کا ایک بُلبُلا ہے جو اُٹھتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔

پرانے زمانے کی لوک کہانیوں میں سایہ بال ہما پڑ جانے کے قصے آج بھی سننے پڑتے ہیں۔ہما دراصل ایک مشہور منگھیالی پرندہ ہے۔جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ جس کسی کے سر پر اس کا سایہ پڑے، وہ بادشاہ بن

جاتا ہے۔ بہر حال انسانی جسم کے سایہ کا مثبت اور منفی دونوں نوعیت کے پہلو ہوتے ہیں جنہیں مُشابہ یا منسوب کرنے سے معنی خیز اصطلاحوں کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ گرمی کے موسم میں مختلف درختوں بالخصوص چنار کے سایہ تلے ایک تھکا ماندہ انسان راحت محسوس کرتا ہے۔ پتوں والے درختوں کے شاخوں کی یک مشت سرسراہٹ سے ماحول سہانا ہو جاتا ہے اور ایسے درختوں کے جھُنڈ کے سایوں تلے استراحت سے بچے، بوڑھے اور عورتیں آرام وسکون محسوس کرتی ہیں۔ وہ اولاد بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کے سروں پر شفیق اور رفیق ماں باپ کا سایہ دیر گئے تک قائم رہتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ سایہ ان کے سروں سے اُٹھتا ہے تو بالآخر وہ یتیم الطرفین ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں انسانیت اپنے حقوق ادا کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔ انسانیت کے تقاضے کوئی صاحب دل امیر یا کوئی فلاحی تنظیم بشمولِ یتیم ٹرسٹ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا یتیم افراد کو اپنے سایۂ عاطفت میں پالنے پوسنے کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے ہیں۔ اگرچہ ایک انسان کا سایہ کسی بھی وقت روشنی سے سیاہی تک موجود رہتا ہے لیکن عملی طور سایہ بنا جسم کا پرتو یا چھاؤں دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے کیونکہ جو لوگ یتیموں کی کفالت کا بوجھ اپنے سروں پر اُٹھا لیتے ہیں انہیں عوامی حلقوں میں سرپرستوں کی

حیثیت میں زبردست پزیرائی نصیب ہو جاتی ہے۔ایسے لوگ سایہ گُستر کہلاتے ہیں اور ان کا یا کہیں پر کسی کے ماں باپ کا اس دنیا سے چلے جانے کو لوگ دونوں کے لئے سروں سے سایہ اُٹھنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی یتیم خانوں کے منتظمین حضرات سایہ ہونے کی صورت میں یتامیٰ کے محافظ، حامی، پناہ دہندہ اور مددگار کہلاتے ہیں۔

جب بھی دو افراد کے درمیاں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں تو دونوں کا خلوص انہیں ایک دوسرے کے ساتھ سایہ بن کر رہنے کا عادی بنا دیتا ہے۔آج کل لوگ جس کسی سیاسی لیڈر کے طرز تخاطب سے یا کسی مذہبی عالم کی اثر دار خطابت سے متاثر ہو جاتے ہیں وہ پھر ان کے فین یعنی کہ شائقین کے طور سایہ بن کر ساتھ رہتے ہیں اور ان کی کسی بھی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر بیٹھتے ہیں۔اس انداز کی ایک اور کڑی وہ میاں بیوی کی جوڑی ہے جو گہرے سُہاگ کی بدولت ایک دوسرے کا سایہ بن کر ساتھ رہنے کا وعدہ کرتے ہیں۔بعض وقت ایسے قبیل کے مردوں کو دوسروں کے طعنے سُننا پڑتے ہیں اور زیادہ تر وہ زن مرید کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

دنیاوی مخلوقات میں اُنس و جان سے انسانوں کے متعلق سایہ کے حوالے سے ذکر تو ہوا لیکن جنات کے متعلق موضوع کے حوالے سے تذکرہ کرنا ابھی باقی ہے۔

جنات سے مراد بھوت پریت، دیو، آسیب، روح، عام انسانوں سے زیادہ کام کرنے والا، سرکش وغیرہ ہے۔ یہ ایک پوشیدہ مخلوق ہے جو آگ سے پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ ان جنات میں ہر ایک کا سایہ منفی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بھوت پریت کا سایہ یا آسیب کا سایہ یا سایہ زدہ یعنی کہ جس پر جن بھوت کا اثر ہو۔ ان بلائے بے درماں سے اکثر لوگ ڈرتے ہیں یا دور دور رہتے ہیں یا بھاگتے ہیں۔ دراصل اس نوعیت کے سائے اتارنے یا اترنے یا آسیب دفع ہونے یا کرنے یا آسیب کا اثر دور کرنے کے لئے اکثر لوگ پیر و مرشد کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ ان کے کسی عمل یا تعویز گنڈے کے بھروسے جن یا آسیب کا سایہ اُترنا ممکن ہو سکے۔ بقولِ شاعر (نامعلوم)

نگاہِ قہر کے آسیب نے وحشی کیا مجھ کو
میرا سایہ اتارو دامنِ چشمِ ترّحم سے

چونکہ سایہ پرورده اِنسان عموماً لاڈلا ہوتا ہے، جس کے لئے داناؤں کا قول ''لاڈلا پُوت کٹورے موت'' ہے۔

عموماً کسی بزرگ یا مجذوب کا سایہ زمین پر پڑنے کے دوران اس کے ساتھ چلنے والوں کو ان کا سایہ پاؤں تلے ملنے سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا انسانی ادب واحترام کے منافی ہوتا ہے۔

گالی گلوچ

گالی اور ڈانٹنا انسانوں کے درمیان میل جول میں رخنہ ڈالنے کی دو ایسی شرارتیں ہیں جن میں سے ایک کا تعلق بدمزاج اور بدسرشت لوگوں کے ساتھ ہے جن کی آبادی بہت کم ہوتی ہے اور جو موروثی بدگو ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری کیٹگری میں عامۃُ الناس شامل ہے۔ بعض حضرات ڈانٹ ڈپٹ دینے میں حدود پار کرتے ہیں جس سے کوئی بھی انسان آپے سے باہر ہو سکتا ہے۔ جہاں تک دشنام طرازی یا گالی گلوچ کی لین دین کے عمل کا تعلق ہے اس کے لئے مادری زبان ہی قینچی کی طرح چلتی ہے اور جس میں گالیوں کی بوچھاڑ کرنے کا جھاڑ باندھنے یا گھڑ گھڑ کے گالیاں دینے میں کسی قسم کی مشکلات پیش نہیں آتی ہیں۔ مادری زبان میں گالیوں کی لین دین کے دوران عجیب و غریب سماں باندھنے میں خواتین کا زیادہ رول رہتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی پہلے سے تیار کیا ہوا اسکرپٹ نہیں ہوتا پھر بھی وہ اپنے سراپا کی نرالی حرکتوں سے خودساختہ ڈائلاگ خوبصورت انداز میں آلاپتی ہیں۔ پرانے وقتوں میں ان مناظر کو دیکھنے کے لئے آس پاس کی بستیوں کے مردوزن اور بچے

اس قسم کی تماشا گاہوں میں جمع ہو جاتے تھے۔

ان تماشا گاہوں پر بیٹھے بعض ناسمجھ لوگ گالیوں کے مزے لیتے ہیں جبکہ غیرت مند حضرات شرم کے مارے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں۔ کبھی کبھی فریقین کے درمیان معاملات سمجھانے سلجھانے کی صورت میں اگر ایک دوسرے کو گالیاں دینا بند بھی ہو جائیں لیکن نوبت ایک دوسرے کو مار پیٹ کرنے تک پہنچ جاتی ہے۔

گالی گلوچ یا گالی گفتار کا مختصر مفہوم خالص بدزبانی یا فحش گوئی سمجھنا کم عقلی ہے کیونکہ جب کسی انسان پر انتقامی ردِ عمل کا جنون سوار ہوتا ہے وہ بے تحاشا گالیاں دینے پر آتا ہے جس کا مطلب ہے غلاظت پھینکنے والے کو اَدل بدل کے طور واپس غلاظت پھینکنا چاہتا ہے۔ جس سے دونوں فریقین کی غلاظت پاشی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ جھنجٹوں میں پھنسے ایسے لوگوں کا ضمیر مردہ ہوتا ہے اور بے غیرتی انہیں اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔

گالی گلوچ اپنی ہیئتِ مجموعی کے اعتبار سے سماجی زندگی میں ایک ناسور ہے۔ یہ نہ صرف یکا یک ہنگاموں کی باعث بنتی ہے بلکہ بغیر سرحدوں کے ایک ایسی سرد جنگ کی صورت اختیار کرتی ہے کہ جس میں دشنام طرازی بجائے خود سامان حَرب ہوتا ہے اور جو دونوں اطراف کے لوگوں کو بکھیڑے میں ڈال کر شرم وحیا کی حُرمت سے محروم کر دیتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آج تک اس گالی گلوچ کے خلاف کسی تھانے میں ایف آئی آر درج ہوا ہے نہ کسی عدالت نے از خود نوٹس لے کر کسی ملزم کو طلب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لا اینڈ آرڈر کے دائرہ اختیار میں نہ آنے سے گالی گلوچ کا باضابطہ ایک کرائم قرار پانا ابھی تک قرین مصلحت جوں کا توں ہے۔ چنانچہ اس معاملے کے قابل سماعت بنانے سے نہ جانے کتنے جج صاحبان، وکلاء اور گواہاں وغیرہ بدکلامی کے الزامات بار بار دہرانے سے گُھٹن محسوس کرتے اور شرمندگی اٹھاتے رہتے۔ شاعروں کی دنیا میں مرزا غالبؔ جیسے عظیم شاعر نے گالی گلوچ کی مناسبت سے کیا پھول جھڑے ہیں۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

چنانچہ ملتِ اسلامیہ اپنے مرد و زن کے جوڑوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کے لئے نکاح باندھنے کی شرعی رسم بجالانے کی پابند رہی ہے جس کے تحت دلہا دلہن نکاح خوانی کرنے کے دوران قبولِ نفس کے کلمات تین بار دہرا کر ایک دوسرے کے لئے حلال ہو جاتے ہیں اور میاں بیوی کہلاتے ہیں۔ اس دوران جو رقم دلہا کی طرف سے دلہن کو ادا کی جاتی ہے وہ مَہر کہلاتی ہے۔ کشمیر میں صدیوں سے لوگ مَہر کو ”لیکہ مول“، یعنی کہ گالی کی قیمت قرار دیتے آئے ہیں جو بہ فرضِ محال پاکیزہ مباشرت کے

لئے ایک قسم کی شرعی رجسٹریشن فیس ہوتی ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض ادنیٰ ذات کے بداخلاق لوگ اپنے مخالفین کے ساتھ نہایت بے غیرتی اور کمینگی سے پیش آتے ہیں۔ اپنے غصے پر قابو نہ رکھتے ہوئے وہ کم سِن اور جوان کو ماں اور بہن جبکہ بوڑھے کو بیٹی کی گالی دینے پر اتر آتے ہیں گویا وہ اپنی فحش کلامی سے دوسروں کو غیر شرعی طور فرضی ساس، بیوی، یا سُسر بنا کر سماج میں جُرم خفیف کا ارتکاب کرتے ہیں جو سراسر اخلاقی اقدار کے منافی ہے۔

ہمارے طالب علمی کے زمانے میں دو انگریزی شبدوں نان سینس اور ایڈی یٹ سے اکثر بچے اور بڑے گالی گفتار مراد لیتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے تحفظات بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ یوں کہ نہ ہمیں کسی کو نان سینس یا ایڈی یٹ کہنا نہ کسی سے کبھی نان سینس یا ایڈی یٹ سُننا گوارا تھا۔ آج بھی لوگ اس قسم کے شرارتی رویہ پر طرح طرح کی رائے زنی کرتے رہتے ہیں۔ نان سینس اور ایڈی یٹ دونوں الفاظ انگریزی زبان سے لئے گئے ہیں۔ نان سینس لفظ سے مراد بے معنی بات یعنی کہ بکواس ہے۔ جبکہ ایڈی یٹ کی معانی فاترالعقل یا بے عقل یا احمق ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اس قسم کی لفظی لین دین کرنے سے کیوں ایک کا غصہ اترتا ہے اور دوسرے کو چڑھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات سکولوں

میں بچے ان الفاظ کو سن کر عموماً چونک اُٹھتے تھے کہ کہیں اس قسم کی جھڑکی پڑنے کا مطلب گالی دینا تو نہیں لیکن مرتے کیا نہ کرتے، ایک بار جو شبہ پیدا ہو گیا، پھر وہ جلد ہی دور ہونے کا نام نہیں لیتا۔ تاہم استادوں کو ان الفاظ کے استعمال کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس قسم کی سرزنش کرنے کے پیچھے ان کا مقصد ہوتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ نان سینس لفظ ایک قابل غور اصطلاح ہے کیونکہ اس میں سینس کا لفظ معنی خیز بھی ہے اور وضاحت طلب بھی۔

یہ کوئی حکمت عملی نہیں بلکہ پتے کی سُناتا ہوں کہ جس نے دوسروں کو ماں یا بہن یا بیٹی کی گالی دی تو گویا اس نے اپنی ہی ماں یا بہن یا بیٹی کو ان کی کسی جرم ضعیفی کے لیے مرگ مفاجات کی سزا دی۔ آخر یہ دشنام طرازی کرنے والے لوگ آسمان سے نہ زمین سے پھوٹ آئے ہیں۔ کہیں آپ اِسے دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے نہ سمجھ بیٹھیں۔

گالی دیتے وقت ایسا کلمہ کہنا جس سے کوئی فرضی رشتہ قائم ہوتا ہو ’’یہاں تو ابھی منگنی تک نہیں ہوئی، پھر ناحق حضور ان بچاری کو ساس کہہ کر ابھی سے گالی چڑھاتے ہیں‘‘۔۔۔ (نامعلوم)

بہرحال زمانے کا پلٹا کھانے سے انٹرنیٹ نے جو دستک دی اور یوٹیوب کا مُٹھیانا شروع ہو گیا ہم نابالغی سے نکل کر بلوغت کے مہاساگر

میں عُریاں ہو کر ڈبکیاں لگانے لگے ہیں۔ جہاں تک گالی گلوچ والی چند بدنام زمانہ بستیوں کا تعلق ہے ان میں خال خال ہی کوئی گھر ہوگا جس میں ایسے بکھیڑے ابھی بھی چل رہے ہوں۔ دراصل گالی گلوچ کی تماشاہ گائیں سماج سے اسی طرح گھٹنے لگی ہیں جس طرح محلوں میں کتوں کی آبادی گاہ بگاہ کے نئے اضافوں کے باوجود بڑھنے کے بجائے گھٹتی ہی جاتی ہے۔

میڈیا والوں کی طرح یہ شاعر لوگ بھی نئے نئے جنجالوں میں ٹانگیں پھنسانے کے درپے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کا کام صرف مجازی طور قصیدہ گوئی یا مرثیہ خوانی ہوتا ہے۔ تاہم دشنام دہی کے موضوع کی مناسبت سے یہاں میر حسن کے ایک شعر کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں

کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں

ساعتیں

آپ عنوان کو دیکھ کر اچنبھے میں نہ رہیں، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ویسے بھی ایسے موضوعات پر قلم برداشتہ لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ تاہم ان پر جیسی تیسی خامہ فرسائی کرتے رہنا میری عادتِ مُستمرہ ہے۔ داناؤں کا قول ہے وقت وقت کا راگ اچھا ہوتا ہے۔ کیوں نہ پھر میں بھی آج اپنا راگ الاپنے بیٹھوں۔ اگرچہ زمانے کا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے پر کہیں سے کسی نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا ہے۔ لیکن میں مرزا غالب کی پالیسی (ہے کوئی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی) کے منافی چُپ نہیں رہوں گا۔ چنانچہ اس کرہ ارض پر انسانی زندگی کا سفر قرار واقعی مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے۔ ایک طرف انسانی جسم کے چیدہ چیدہ اعضاء خاص کر دل، دماغ، زبان اور آنکھیں انفرادی طور اعلیٰ خصوصیات کی مظاہر بن جاتی ہیں جس کی عالمی سطح پر دھوم پڑتی ہے اور خود ان اعضاء سے مُرکب، انسان بھی مستفیض ہو جاتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کے عرصہ زیست کے دن رات اور ماہ وسال کے چرچے پھیلتے ہیں جبکہ دن رات

کے خاص پہروں، ساعتوں لمحوں، پلوں وغیرہ کو ''لڑے سپاسی نام پائے سردار'' کے مصداق نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ چھوٹے میاں سو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ! لیکن جناب، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خاص خوش آیند اور تہلکہ خیز ساعتیں نہ صرف انسانی زندگی کے سفر میں انقلابی نوعیت کے حالات پیدا کر دیتی ہیں بلکہ تاریخ بھی رقم کرتی ہیں۔ کئی دہائیوں سے ہم سُنتے آئے ہیں کہ ''لمحوں نے خطا کی تھی، صدیوں نے سزا پائی''۔ بہر حال موجوداتِ عالم میں جسم انسانی کے خاص اعضاء کی طرح قابل قدر اور لایق تشہیر چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ انسان بھی عجب ذات ہے، اسی نے کلنڈروں، تقاویم اور ڈائریوں کو معرضِ وجود میں لا کر دن رات اور ماہ و سال کی اجارہ داری یا مناپلی کو پروان چڑھایا ہے اور یہ بھول گیا ہے کہ دنیا میں کلاک، گھڑی یا دیگر قسم کے وقت بتانے والے آلات کی بدولت دن رات کے سیکنڈوں تک کی شماریات منظر عام پر آجاتی ہیں۔

وہ مبارک گھڑیاں جو خوش نصیبوں کی جھولی میں ڈھیر ساری خوشیاں بھر دیتی ہیں، یادگار زمانہ بننے سے رہ جاتی ہیں کیونکہ ایسی تمام ساعتیں دنوں کے نام منسوب ہو جاتی ہیں۔ کلنڈروں میں بھی ایام پیدائش، وِصال، آزادی، تاسیس اور مذہبی تہوار وغیرہ انفرادی طور خوبصورت انداز میں مشتہر کئے جاتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ اونچ نیچ کی پرابلم سے نہ صرف بنی آدم بلکہ

فطرت کا گردش دوراں بھی دو چار ہوا ہے۔ وقت یہ جانتا ہے کہ اس کے اپنے اجزاء میں ساعتیں، لمحات، پل وغیرہ ہی واقعات کے لئے نتیجہ خیز یا ثمر اُمید ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی کے جنم لینے کی ساعت یا موت واقع ہونے کی گھڑی پورے دن کے نام منسوب ہو جاتی ہے جبکہ ساعاتِ وقوع نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ تاہم مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کو وقت کے ان جُزویاتِ لاینفک کا اپنی نگارشات میں حوالہ دینا پڑتا ہے۔ اگرچہ نظام الاوقات میں شامل زمانہ یا وقت کے اجزائے ترکیبی ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں پھر بھی ان سے منسوبہ خاص موقعوں کی انفرادی خصوصیات کا سکہ بیٹھا رہتا ہے۔ دنیاوی زندگی کے سفر میں آغاز سے خاتمہ بالخیر تک ایک انسان کو عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آخری آن سرخرو ہونے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مومن خان مومن کو کیا سوجھی ہے وہ بھی ملاحظہ کریں۔

ایک آن بھی مجھ سے نہ لو آٹھ پہر میں
گھر چھوڑ کے اپنا رہو اغیار کے گھر میں

فی الحقیقت دن رات کی ساعتیں، لمحے، لحظے، پل، دم، وقفے وغیرہ زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے لبریز ہوتے ہیں۔

بہر حال کبھی کبھی کوئی ساعت یا گھڑی زبردست اہمیت اور افادہ عام کی حامل ہوتی ہے جو دلوں پہ سدا راج کرتی ہے۔ بقول شاعر۔

آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاویداں سے

جب ہندوستان میں بعض لوگ جانوروں کی آواز سے شگون لیتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ ساعتِ حسن یا ساعتِ سعید کو آوازِ خلق نقارہ خدا کی مثل نعمتِ خداوندی سمجھیں۔ مسلمانوں کے لئے جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت کے موجود ہونے کی بشارت دی گئی ہے کہ جس کے دوران جو بھی دعائیں مانگی جائیں وہ یقینی طور قبول ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات امتحانی نتائج کی طرح ساعت حسن کے پانے کے انتظار میں نہ جانے کتنی ساعتیں آب رواں کی طرح ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔

اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد احقر کی شکایت بدستور اپنی جگہ پر موجود ہے کہ ان پہروں، ساعتوں اور لمحوں وغیرہ کے ہتھے چڑھنے والے خاص واقعات سالم دن یا شب کے نام حاشیہ چڑھائے جاتے ہیں۔ گویا ''لڑے سپاہی نام پائے سردار''۔

جس طرح لوگ اپنے اپنے مذہب پر چل کر خالق سے زیادہ مخلوقات کی نظروں میں پارسا دِکھنا چاہتے ہیں بالکل اسی ڈگر پر وہ ملاحوں کی طرح ہوا کا رخ دیکھ کر ناؤ کھینے کے مشابہ کوئی اپنا کام شروع کرنے کے لئے مبارک گھڑی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ہندوؤں کے یہاں علم نجوم

کے مطابق مہورت دیکھنے کا رواج رائج الوقت ہے۔ مبارک گھڑیاں یا نیک ساعتیں پانے کے لئے خدا کے بندوں کی جستجو یوں ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے حصولِ مرام سے گویا ناگہانی قرعہ اندازی سے لاٹری نکل آتی ہے۔ اِدھر سے شادی بیاہ کے موقعوں پر ساعت نامے مقرر کرنے کا رواج بھی باورچیوں کی مصروفیات بڑھنے اور بھاو چڑھنے کے سبب آناً فاناً ساکت ہو گیا ہے۔ اسکے برعکس حالاتِ مجبوری کے موجب باورچیوں کے دستیاب ہونے کی تاریخیں دعوتی مجالس میں ٹھہرا کر ساعت ناموں کی زینت بنائی جاتی ہیں۔

دن رات کو چار چاند لگانے والی یہ پہر، ساعتیں، لمحے، لحظے، پل، وقفے اور دم وغیرہ دراصل گردشِ دوراں میں وقت کے ہی چھوٹے چھوٹے حصے ہیں اور ان حصوں سے ہی ماہ و سال بنتے ہیں۔ زمانے میں ان کی تگ و دو لگی رہتی ہے جس سے ان کا چرچے میں رہنا ایک قدرتی بات ہے۔ مثال کے طور ان اصطلاحات کا استعمال وقتاً فوقتاً کیوں ہوتا رہتا ہے، ملاحظہ کریں۔

آنِ واحد میں، پل پل کی خبر، دم غنیمت ہے، گھڑی میں ماشہ، گھڑی میں تولہ، لحظہ بہ لحظہ، لمحہ فکریہ، پچھلا پہر، ساعتِ آخر، دم کا مہمان۔ دم ہے تو کیا غم ہے، یا یہ شعر۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

زندگی کے سفر میں اور بھی کئی حسین لمحے یا ساعتیں بنی آدم کے نصیبوں میں ہوتی ہیں، شادی بیاہ کے موقعوں پر وہ ساعت کتنی خوبصورت اور متاثر کُن ہوتی ہے کہ جب ایجاب وقبول کے وقت دلہا ایک سوال کے جواب میں دھیمی آواز سے "ہاں" کہتا ہے اور دلہن شرم حضوری سے سر ہلا کر "قبول ہے" جواب دیتی ہے۔

لوح و قلم

لوح کا مطلب سیدھے سادے لفظوں میں لکھنے کی تختی یا قبر کے سرہانے کا پتھر یا سِل ہے۔قلم کی معانی بھی اسی انداز میں لکھنے کا آلہ" یا رنگ سازی و مصوری کا برش ہے۔لوح وقلم مل کر رنگا رنگ دستاویز منظر عام پر لاتے ہیں۔ایسے کام انسان ہی انجام دیتے ہیں جن کے قلم میں زور ہوتا ہے۔ کوئی "پہلے مرغی آئی یا انڈا آیا" کی مِثل یہ سوال کیوں کرے کہ کیا پہلے"لوح آئی یا قلم آیا" میرے خیال میں لوح وقلم قدرت کے خاص عطیات میں شامل ہیں اس لیے یہ معاملہ اگر رازِ سر بستہ ہی رہے تو بہتر ہے۔تاہم یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ لوح اور قلم ایکدوسرے کے لئے اُسی طرح لازم وملزوم ہیں جس طرح میاں بیوی آپس میں جیون ساتھی کے طور لابُدی ہیں۔زبانی بیان ہو یا خطابت، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض موقعوں پر کسی کسی کی زبان قابو میں نہیں رہتی جو واضح طور بشری فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کے برعکس قلم چلاتے وقت دماغی توازن کا برقرار رہنا لازمی ہوتا ہے۔ورنہ مکتوب ہو یا مضمون، ایک کھردرا تحریر تصور ہوگی۔کہیں آپ نے اپنا

ذہن خدا کے لوح وقلم کے وجود پر اٹکائے تو نہیں رکھا ہے! چلیے ہم بھی مانتے ہیں کہ لوح وقلم سے مراد خدا کے احکام کی تختی اور ان کے لکھنے کا قلم ہے۔ تاہم لوح اور قلم کی بہت ساری معانی ہیں۔ اسی لوح وقلم کے سہارے کاغذی تختی یعنی کہ کاغذ پر قلم برداشتہ لکھنے کا ارادہ کر چکا ہوں تاکہ سند رہے۔ بہرحال لوح یا تختی یا پھر مختلف صورتوں میں کاغذ کی دستیابی نوشتہ جات اور تحاریر کے لئے ہوتی ہے۔ قلم تو ایک لکھنے کا آلہ ہے جو دنیا میں ہر سال اپنا رنگ روپ بدلتا رہتا ہے۔ پرانے زمانے میں نب والے قلم استعمال ہوتے تھے۔ سکولوں میں پرائمری جماعتوں کے لئے ایرانی طرز کے ناگری قلم بچوں سے تختی یا مشق لکھوانے کے لئے رائج تھے۔ ناگری قلم تراشنے یا چھیلنے سے بنائے جاتے تھے۔

ارض وسما، آفتاب ومہتاب، عرش وکرسی اور لوح وقلم قدرت کی وہ خاص موجودات ہیں جن سے دنیاوی زندگی کا سفر رواں دواں ہو کر اپنی منزلِ مقصود کو پہنچتا ہے۔ لوح وقلم کا ذکر کرنے سے لوحِ محفوظ کا خیال ذہن میں آجاتا ہے۔ جس صورت گری سے پانی کے لفظ کے ساتھ سمندر، دریا جھیل، کُنویں، چشمے، آبشار، جھرنے اور ندی نالے از روئے فطرت جُڑے ہوئے ہیں بالکل اُسی طرح لوح کے لفظ کے ساتھ پیشانی، سیمیں، زبرجد، طِلسم، مشق، محفوظ، نویس اور تربت یا قبر لغوی طور پیوستہ ہیں۔

اگر ہم لوحِ محفوظ سے پردہ اٹھائیں تو یہ وہ تختی ہے جس پر خدا نے دنیا میں ہونے والے ہر فعل کی نسبت ابتدا سے انتہا تک اسی طرح اندراج کیا ہے جس طرح نعوذ باللہ لارنس نے زمینی رقبہ جات کا جمعبندی اور نقشہ حدود بست میں کرایا تھا اور جو محافظ خانہ میں آج بھی موجود ہے تاہم اس حقیقت کا سب کو اعتراف ہے کہ لوحِ محفوظ لافانی اور محافظ خانہ فانی ہے۔ لوحِ محفوظ کے اندراجات کا علم فقط خالق کائنات کو ہے جس کے لوح وقلم کی تحاریر میں کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔

اَب آتے ہیں لوحِ مشق کی جانب، لوح وقلم کے مُتشابہ لوحِ مشق سے مراد وہ تختی یا مشق ہے جو ہمارے زمانہ طالب علمی کے دوران سرکاری سکولوں کی ابتدائی جماعتوں میں رائج تھی۔ اس پر لکھنے کے لئے ناگری قلم اور پہاڑی مٹی کی ایک خاص قسم سے بنائی گئی روشنائی استعمال میں لائی جاتی تھی۔ لکڑی سے بنی لوح یا تختی کو مشق کا نام دیا گیا تھا۔ اساتذہ بچوں کو بطور ہوم ٹاسک روزانہ صبح دعائیہ مجلس کے دوران گھر میں لکھی گئی دوطرفہ مشق کا معائنہ کرتے تھے۔ سکول اوقات کے دوران بھی بچوں کو اس قسم کے لوح وقلم میں مصروف رہنے دیا جاتا تھا۔

لوحِ پیشانی بھی لوح وقلم کے نہایت قریب ہے۔ وہ اس طرح کہ انسانی جسم کے سر کا اگلا حصہ جو بھوؤں کے اوپر اور بالوں کے نیچے ہوتا

ہے۔ پیشانی یا ماتھا کہلاتا ہے۔ ماتھا ٹیکنا یا پیٹنا یا رگڑنا یا کوٹنا یا ماتھے پر بل پڑنا یا شِکن ہونا یا بیتنا یا پسینا ہونا، یہ وہ علامات یا افعال ہیں جو اگرچہ قلم سے تحریر میں نہیں آئے ہیں بلکہ خود بخود عیاں ہیں اور بالترتیب سجدہ کرنے ماتم کرنے، عاجزی سے سجدہ کرنے، افسوس کرنے، ناراض ہونے، رنج یا ناگواری گزرنے، مصیبت آنے اور غم یا شرمندگی ہونے کو ظاہر کرتے ہیں۔

لوح و قلم ایک منبع کے مانند ہے جس سے متنوع نوشتے یا نگارشات برآمد ہوتی ہیں۔ لوح اور قلم نے اپنی اپنی حیثیت میں القاب پائے ہیں جیسے کہ لوح نویس، عرائض نویس، نقل نویس، قلم رو، قلم دان، قلم تراش، قلم کش، قلم کار وغیرہ وغیرہ۔ بقولِ شاعر۔

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں
تو دل کچھ اور کہتا ہے قلم کچھ اور کہتا ہے

(ظفرؔ)

قلم، لوح پر یا لوح نما چیز پر لکھنے کے لئے زمانہ قدیم سے مستعمل ہے۔ ناگری قلم کے لئے روشنائی بھری دوات اور عام قلم کے لئے سیاہی درکار ہوتی تھی، اب تو زمانہ بدل گیا ہے آج کے قلم خودکار ہوگئے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کی آمد کے ساتھ ہی قلمی وسائل میں اضافہ ہوا ہے، لوح بھی ساتھ ساتھ اپنا وجود منوانے کے لئے رنگ و روغن بدلتی رہتی ہے۔

قلم کا راج تو دنیا پر ہے ہی، لیکن سیاسی طور بھی اس نے حکومتوں کے اندر قلم دان وزارت کے طور رسائی حاصل کی ہے حالانکہ اپنی پرانی حیثیت میں قلم دان ایک چھوٹی سی ڈبیا کا نام تھا جس میں قلم، دوات، پنسل وغیرہ چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہی اسے دفتروں کی زینت وزیبائش بننے کا اعزاز ملا۔ جمہوری حکومتوں میں وزیروں کے اپنے اپنے ذمے عہدے قلم دانِ وزارت کہلاتے ہیں۔ قلم کی کچھ کارستانیاں ہماری سماجی زندگی میں بھیانک اثرات کے متحمل رہی ہیں۔ تاریخ پیدائش، زمینی ریکارڈ اور سندات وغیرہ کو قلم زد کرنے یا ان پر قلم پھیرنے کے واقعات آج بھی سننے کو ملتے ہیں۔ تاہم نئی ٹیکنالوجی سے اگرچہ اِس قسم کے قابل سزا افعال میں کمی آنے لگی ہے پھر بھی انٹرنیٹ کے چلنے سے نئے خدشوں کا سامنا کرنا شروع ہو گیا ہے۔ جعلی سندات اور ذاتی ضرورت کے کاغذات کا اِجرا بھی لوح و قلم پر ایک بدنما دھبّا ہے۔

لوح و قلم کی کہانی میں بنی نوع انسان قلم کار کا رول نبھاتا ہے۔ کسی بھی قابل اعتراض تحریر کے لئے قلم کار ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے جبکہ گوہر افشاں تحاریر قارئین دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھی اِن میں سے بعض قابل اعتراض تحاریر کو بھی ہدفِ تنقید بننا پڑتا ہے۔

مجبوری

بنی آدم کا کسی معاملے پر اپنا پورا اختیار یا ادا کرنے کی سکت کھو دینے کا نام مجبوری ہے۔ مجبوریاں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو فطری ہوتی ہے۔ اس قبیل میں مفلوک الحال لوگ شامل ہیں جنہیں زمانے کا ورق الٹ جانے سے بی پی ایل کیٹگری میں روٹی، کپڑا اور مکان کی مجبوریاں رفع دفع ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کی مجبوریاں وارداتِ ناگہانی اور ناگزیر حالات کے سبب امیروں اور غریبوں، غرض ہر کسی بنی نوع انسان کو گھیر لیتی ہیں۔ تیسری قسم کی مجبوریاں اس لئے مشکوک ہوتی ہیں کہ ان میں ہر وضع کی مجبوری جیسے غریبی، ناداری، محتاجی، مفلسی، بے بسی، تنگی، عاجزی، ناچاری کے روپ مصنوعی طور اپنائے جاتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ قومی سطح پر رشوت ستانی کی طرح اِس شدید نوعیت کی نقلی مجبوری کو کنٹرول میں رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ تخلیق دنیا کے ساتھ ساتھ موجودات کا ہونا اگرچہ خدا کی مجبوری نہ تھی مگر بحیثیت مختارِ مطلق یہ اس کی کرشمہ سازی میں شامل ہے۔ تاہم بہشت میں مقیم ہوئے آدم کو شیطان

کے ورغلانے پر باہر نکالنے اور عالم اسباب میں رہائش پذیر کرنے کے عمل کو انسانوں کی دنیا میں مجبوری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ شاید ایک آدم زاد شاعر نے بھی اِسی نکتے کی باپت ردِ عمل کا اظہار یوں کیا ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہم کو عبث بدنام کیا

کبھی کبھی یہ مجبوری بھی اپنے مثبت انداز میں کرشمے دکھاتی ہے۔ چاند پر جانے کے کٹھن سفر کو اختیار کرنے میں انسان کی یہ مجبوری تھی کہ وہ تسخیر کائنات کرنے سے افشائے رازِ سربستہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تاکہ خلقتِ خدا کی معلومات میں اِضافہ کرنے اور ان کے حفظانِ صحت کی ہنگامی نوعیت کے معاملات سے نبرد آزما ہونے کے لئے ممد و و مددگار ثابت ہوسکے۔ چنانچہ جان لیوا بیماریوں اور دیگر موذی امراض کی تشخیص و علاج ہونے کی مجبوری سے ہر طرف مایوسی کا عالم تھا اور یہ میڈیکل سائنس کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو دائم المرض لوگوں اور بے بسی کے شکار معذورین کے لیے خوش آئند مستقبل کی اُمیدیں لگائے رکھنے کی فضا پیدا ہوگئی۔ ہوا، پانی اور آگ کو کنٹرول کرنے کے لیے اشرف المخلوقات یعنی کہ انسان نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ سمندر کے پانیوں پر قابو پانا، خلا اور زمین کے درمیان ہواؤں کو اپنے بس میں کرنا اور اعضائے رئیسہ کی سرجری وغیرہ

انسانوں کی بالعموم اور میڈیکل فریٹرنٹی کی بالخصوص وہ مجبوریاں رہی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے میں اسے بتدریج کامیابیاں حاصل ہوتی رہی ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی انسان کی مجبوری کو لوگ حقیر سمجھ کر نظرانداز کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے موقعوں پر مجبور انسانوں کو آسرا دینے کے بجائے تیکھے کلمات سنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جو اس طرح کے ہوتے ہیں۔ ''آپ کی مجبوری آپ کی ہے، میری نہیں! اور میں نے تمہاری مجبوری کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے''۔ الغرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔

فی الواقع بیماریوں کی مِثل مجبوریوں کے کلنڈر نہیں ہوتے ہیں، تاہم بنی نوع انسان کو زندگی کے سفر کے دوران گاہ بہ گاہ کی اتفاقیہ مجبوریوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم غور وفکر سے کام لیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگی کہ اس دنیا میں ہر بشر کسی نہ کسی ضرورت کا محتاج ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی وقت ایک رئیس زادے کو بھی معمولی سی چیز ملنے کی مجبوری ہوتی ہے۔ مسافرت کے دوران ایک انسان پردیسی یا غیر ملکی کہلاتا ہے جس سے وہ اجنبی بن جاتا ہے۔ اس اجنبیت کے سبب وہ جن مجبوریوں سے دوچار ہو جاتا ہے ان کی مدافعت کرنے کے لئے اُسے آسرا ڈھونڈنا پڑتا ہے جو اکثر لوگ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے ہیں۔

مشہور کہاوت ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میرے خیال میں

ضرورت مجبوری کی ماں ہے۔ مجبوری ہی ہمیں وقتاً فوقتاً ضرورت کی یاد دلاتی ہے۔ اگر ایک انسان کی طبیعت گاڑی چلاتے اچانک خراب ہو جائے اور وہ ڈرائیونگ کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو، ساتھ والے بھی گاڑی چلانا نہ جانتے ہوں تو ایسی صورتِ حال میں مجبوری کا خمیازہ دونوں بیمار پڑے ڈرائیور اور ڈرائیونگ سے انجان ساتھیوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ دریائی سیر کرتے ہوں، اچانک طوفانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کشتی جس میں آپ اور دوسرے لوگ سوار ہیں ہچکولے کھانے لگتی ہے وہ لوگ جو تیرنا جانتے ہیں کنارے لگ سکتے ہیں، پس اگر آپ تیرنے کا فن نہ جانتے ہوں گے تو کیا کریں گے؟ یہ الگ بات ہے کہ تیراک ہی ڈوبتے ہیں۔ اس قسم کی بیسوں مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان نارمل حالات میں کبھی کبھار ہی مجبوری کی زد میں آجاتا ہے۔ جبکہ نامساعد حالات میں ایک انسان کو دفعتہً مجبوری سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

کائینات کے رازہائے نہانی ہماری عقل کی حدود سے باہر ہیں، لہٰذا اخفائے راز کو رہنے دینا ہماری مجبوری ہے۔ تاہم کچھ راز سربستہ ہیں جن کے ظاہر ہونے کے لئے بنی نوع انسان نہ صرف کتابوں میں کھوجتا رہتا ہے بلکہ مفکرین اور دانشوروں سے اصلیت جاننے میں لگا رہتا ہے۔ بہر حال اپنی ابتدا اور انتہا جاننے کی بنی آدم کو کوئی مجبوری نہیں ہے کیونکہ

جو چیز ہمارے سوچنے کی حدود سے باہر ہے اس کا ادراک اسی خالق کائنات کو ہے جس نے یہ کائینات تخلیق کی ہے۔

کسی کی یہ سُنی سنائی بات کہ "مجبوری کا نام زندگی ہے" ہمیں دعوتِ غور وفکر دیتی ہے۔ ویسے بھی زندگی کے ہر لمحے پر بنی آدم کو زندگی کی تگ و دو میں ٹھوکریں بھی کھانا پڑتی ہیں، پھر وہ کبھی بے یار و مددگار تو کبھی بے بسی اور کبھی بے کسی کی ساعتیں گزارنے کے بعد اشرف المخلوقات کہلانے کا ثبوت دیتا ہے۔

کبھی کبھی ایک مجبور انسان اپنے آپ پر قابو پا کر صبر کا دامن تھام لیتا ہے اور کسی کو بھی اپنے آپ کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے نہیں دیتا۔ دنیا میں اگر مجبوریاں نہیں ہوتیں تو انسان کے تیوروں کو پہچاننے میں مشکلیں پیش آتیں۔

چھتری

کیا ہی خوب مشابہت پائی جانے کا عندیہ کھلتا ہے۔ ''دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست۔ در پریشان حالی و درماندگی''۔ اتفاق کی بات ہے کہ چھتری بھی بارشوں کی پریشانی اور دھوپ کی تمازت کی تکلیف کے دوران تھامنے والے کی سروپا کا تحفظ کر کے انسان دوستی کا ثبوت دیتی ہے جبکہ اچانک ہوا فر فر چلنے کے دوران انسان بھی چھتری کے ڈنڈے کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے اپنی وفاداری کا بین ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لغوی طور چھتری سے مراد چھوٹا چھاتا یا چھتر یا کبوتروں کے بیٹھنے کا اڈا یا ڈولی کے اوپر کا ٹھٹھر یا سر کے بڑے اور گھنے بال وغیرہ ہے، چھاتا یا چھتر سے مراد بڑا چھاتا یا نم گیر یا شامیانہ یا سائبانہ یا چھت گیری ہے، گرامر کے اعتبار سے تو چھاتا یا چھتر مذکر اور چھتری مونث ہے۔ یہ چھتری کی بڑائی ہے جو اسے چھاتا یا چھتر بنا دیتی ہے گویا کہ چھوٹے میاں سو چھوٹے

میاں، بڑے میاں سبحان اللہ۔

کون نہیں جانتا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ بُنیادی طور فضائے بسیط کی وہ انتہا جہاں ہماری نظر جا کر ٹھہر جاتی ہے آسمان کہلاتا ہے جو ازل سے ابد تک ساری دنیا کے اوپر ایک چھتری کی مانند سایہ افگن ہے، اس پر طرّہ یہ کہ سورج کی گرمی سے بچنے کے لئے چھتری کا بھی ایک رول ہوتا ہے۔

فی الحقیقت آدم خاکی کو اپنی زندگی کی شروعات ہی میں اپنے آپ کو ڈھانپنے کا عادی بننے کی مشق کرنا پڑی تھی۔ چنانچہ بہشت سے سراندیپ میں اتار کر انجیر کے درخت نے حضرت آدم کی برہنگی کو چھپانے کے لئے چھتر کے مشابہ ایک پتا دیا تا کہ اپنے اعضائے حیا کے اوپر پردہ رکھے جبکہ حوا علیہ السلام کو جدہ میں چھتر چھایا کی خاطر سمندر کے کنارے ڈال دیا گیا۔

اگر ہم چھتری کا بہ غور جائزہ لیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ وجودِ آدم خاکی سے ہی بارشوں اور سورج کی حرارت سے پناہ دینے والی چھتری نے پوری کائنات میں اپنی بالواسطہ آمد سے اپنا لوہا منوایا تھا، وہ اس طرح کہ دنیا میں آدم زادوں یا آدم زادیوں کو جنم لیتے ہی لباس زیب تن کی پناہ میں لانا ضروری ہوتا ہے۔ قدرت نے بنی آدم کو جنم دن سے ہی لباس پہن

کر چھتری جیسی چھت کے تلے مکان میں رہن سہن کرنے کا ادھیکار دیا ہے۔

چنانچہ لگاتار بارشوں یا گرمی کی شدت کے دوران چھتری کے بجائے ایک چھاتا زیادہ سے زیادہ دو افراد کو ماسوائے نامحرم خاتون پناہ دے سکتا ہے۔ تاہم چھتر ہو یا چھتری، اس نوعیت کا سہارا ملنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بس میں سفر کرنے کے دوران کوئی سیٹ پر بیٹھا مسافر کسی بغیر سیٹ کے مسافر کو اپنے زانوؤں پر بٹھانے کی فراخدلی کا مظاہرہ کرے۔

دراصل ایک چھاتا یا ایک چھتری کے فوائد براہ راست ایک فرد کے لئے اطمینان بخش ہونے سے صاف ظاہر ہوتا ہے اجتماعی چھاتوں کا کام سائبانوں اور شامیانوں سے لیا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مہاجرین کے لئے کسی بھی جگہ پر تنبو یا خیموں کی صورت میں پناہ گاہیں کھڑا کرنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ ایسے تنبو یا خیموں میں بہت سارے مہاجرین یا سیلانیوں کو سما جانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ گویا چھایا بڑی مایا ہے۔

خواتین بالخصوص امیر زادیاں بارانِ رحمت یا زحمت یا تپتی دھوپ کے دوران رنگ بہ رنگ کی چھتریاں لے کر نہ صرف ماحول کو رنگین اور دیدہ زیب بنا دیتی ہیں بلکہ جمالیاتی ذوق کو اُجاگر کرتی ہیں۔

اکثر لوگ خاص کر سرکاری اور نجی اداروں میں کام کرنے والے

کرمچاری اپنے چھاتے دفتروں یا دکانوں پر بھول جاتے ہیں۔اس لئے مسجدوں، مندروں، گوردواروں، دفتروں اور دکانوں وغیرہ میں ایک ایسے بینر کا چسپاں ہونا لازمی ہے کہ جس پر جلی حروف میں ''اپنا چھاتا لینا نہ بھولیں'' لکھا گیا ہو۔ یہ سچ ہے کہ چھاتا یا چھتری بارش یا شدید دھوپ سے تحفظ کے لئے ایک روایتی آلہ تحفظ ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے فول پروف بچاؤ کے لئے برساتی یا رین کوٹ نام کا جسمانی چھاتا مارکیٹ میں اتار دیا ہے کیونکہ ایک تو چھاتا کی بھول چوک راہ میں حائل رہتی ہے دوم بارشوں کے دوران بغیر چھاتوں کے لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے جہاں اپنے چھاتے پر فخر ہونے لگتا وہیں جذبہ انسانیت قرارِ دل چھین لیتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض حضرات ہاتھوں میں چھتریاں اٹھاتے اپنے اوسان میں نہیں رہتے ہیں جبکہ کچھ لوگ چلتے چلتے ایک دوسرے کے دھکم دھکا سے چھاتا یا چھتری کو کنٹرول میں نہیں رکھ پاتے ہیں۔اس کے علاوہ چھاتا یا چھتری کی پائیداری کی پرکھ ہوا کے تھپیڑے طے کرتے ہیں، بقول شاعر۔

چھتری لگا کے گھر سے نکلنے لگے ہیں ہم
اب کتنی احتیاط سے چلنے لگے ہیں ہم

چھاتا یا چھتری کو معمولی آلہ سمجھنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس

نے ہمارے ہاتھوں میں تھامنے کے دوران دھرتی سے فضائیہ تک اپنی اڑان بھری ہے اور آہستہ چلتے چلتے ہوائی چھتری یعنی کہ پیراشوٹ بن گئی ہے۔ اس نوعیت کے عظیم کام انجام دینے والی ہوائی چھتری فضائی سفر کرنے والوں کے لئے لائف لائن بن گئی ہے۔ کبھی کبھی ہم دشمن کی سرحد کے قریب چھاتا بردار فوج اتارنے کی خبریں بھی سنتے ہیں گویا اس چھاتا یا چھتری کا دفاعی سازوسامان میں شامل ہو کر اپنے کرتب دکھانے کا ڈنکا بجنے لگا ہے۔

چھاتا یا چھتری کی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی صدائیں ہم صدیوں سے سنتے آئے ہیں۔ تاریخ سے پتا لگتا ہے کہ راجا یا والی ریاست کو چھتر پتی کہا جاتا تھا یا وہ افسر جس کے سپرد چتر شاہی ہو۔ چنانچہ بانڈ پاتھر میں مہاراجا اور مہارانی کو پیش گاہِ ایوان پر چھتری کے سائے میں کھڑا رہ کر خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ہندو دھرم میں پہلے سے ہوتا تھا اور اب دوسرے فرقے بالخصوص مسلمان شادیوں کے موقعوں پر دلہا دلہن کو چھاتا یا چھتری کے سائے میں کھڑا رہتے اگوانی کرتے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے کہ جہاں پرانے بادشاہوں کا سواگت کرنے کے لئے ان کا چھتری کے سائے تلے کھڑا ہو کر رہنا ضروری ہوتا تھا وہاں آج کسی بھی بڑے حکمران کا چھتری کے بجائے بلیٹ پروف گاڑی میں اور شیشے کے بلیٹ پروف گنبد کے سائے میں کھڑا رہنا اس کے حفظِ جان کے لئے لازمی ہوتا ہے۔

چنانچہ جب ہم ڈھانپنے یا ڈھانکنے، پردہ کرنے، چھپنے، چھپانے، پناہ دینے، سایہ ڈالنے یا سایہ تلے آنے وغیرہ جیسے افعال کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں، تو ماحصل کے طور چھتری کے سایہ کے تناظر میں سرپرستی کا سایہ، سایۂ عاطفت، سایہ گستر، سایۂ بالِ ہما، سایۂ خدا، سایہ زدہ جیسی صورتیں نظروں میں منڈلاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جن دوستوں کے والدین حیات ہیں تو گویا والدین کا سایہ چھتری کی مانند ان کے سروں پر قائم رہنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اکثر جگہوں پر یتیم خانوں کا قیام اسی چھتری کی بمثل لغیر سرپرست بچوں اور بچیوں کا سایہ گُستر بننے کے لئے عمل میں لایا گیا ہے۔ ایک چھاتا کا سینہ جتنا زیادہ کشادہ ہو اتنی ہی زیادہ تعداد کے لوگوں کی سرپرستی ہوسکے گی۔

کالے بادلوں کے سائے میں کالے رنگ کی چھتری تلے انسانی سر کے گھنے گھنے یا بکھرے ہوئے کالے بالوں میں بھی چھتر چھایا کی اِمدادی خاصیتیں ہوتی ہیں۔ چھاتا ہو یا چھتری، ان سے ہمیں جو دروس ملتے ہیں ان کے مطابق دنیا میں چھوٹوں کے سروں پر بڑوں کا سایہ قائم رہنا اور ہر میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لئے سایہ بنکر ساتھ رہنا بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ زندگی خود ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی مانند ہے۔

فرصت

میرے خیال میں جو وقت، کم ہی سہی، کسی قسم کے داخلی خلفشار اور خارجی کھینچا تانی کے بغیر آرام و سکون سے گزرے اس کو فرصت یا فراغت کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ فی الحقیقت یہ دنیا بنی آدم کے لئے ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ ایک تھکے ماندہ مسافر کی مِثل تکان اتارنے کا ٹھکانا ہے۔

لوگ فرصتوں کے دوران کانٹوں پر تڑپتے میں گویا ''گئے تھے نماز بخشوانے، گلے پڑے روزے''۔ کون نہیں جانتا کہ ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں''۔ حضرت قبر میں جا کر بھی ''دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر'' والی پوزیشن ہوگی۔ نکیر و منکر کی پوچھ گچھ سے چھٹکارا مل کر کون جانتا ہے کہ فرصت یا مہلت ملنے کی کیا حکمت الٰہی ہوگی۔

فرصت لفظ کے مترادفات مہلت اور فراغت ہیں۔ یوں تو لوگ فرصت نہ ملنے کا شکوہ سرِ عام کرتے رہتے ہیں۔ کیوں نہ کریں، آخر فرصت کی معانی چھٹی، چھٹکارا، اطمینان، آرام، موقع یا خلوت کا وقت جب ہیں۔ دنیا

میں اب ایسے مواقع ملنا عنقا ہو گیا ہے ادھر سے الیکٹرانک میڈیا نے فرصت کا حلیہ بگاڑ کر اسے وقفہ یا بریک یا انٹرول بنایا ہے۔ فی الحقیقت بنی آدم کو کبھی کبھی فرصت نصیب ہونا مقدر میں لکھا ہوتا ہے۔ اچانک کسی قسم کی علالت میں پڑ جانے کے دوران ایک علیل انسان کو اپنوں کی تیمارداری میسر ہونے کے سبب فرصت سے رہنے کا موقع ملتا ہے۔ تاہم بنی آدم فرصت پانے کے باوجود مشغولیات کے متواتر اُمڑنے سے عدمِ فرصت کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر مہلت نہ ملنے کے راگ الاپنا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ شاعر نے بھی ایسی صورت حال کی کچھ الگ انداز میں ترجمانی کی ہے۔

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو تم فراغت زیادہ

بہر حال اب یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ایک انسان کو عجلت نہ ہونے کے باوجود بھی بعض مصروفیات کی طرف رخ کیوں کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ذمہ داری بھی اسی ایک انسان پر عائد ہوتی ہے کہ جو اپنی مشغولیت قائم رکھنے کے لئے اسباب پیدا کرتا ہے یا یوں سمجھیں، گویا ساری جہاں کا غم اس کے دل میں ہوتا ہے۔

فرصت سے مراد ٹھہراؤ یا توقف یا رکاوٹ بھی ہے۔ زندگی میں وقت وقت پر ایک خاص مہلت ملنے کا اہتمام کرنا ہے کہ جس کے

دوران کیا بچے، کیا جوان، کیا بزرگ سب لوگ باری باری ہیر کٹنگ سیلونوں پر فرصت سے بال تراشتے یا شیو کراتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھیں تو دن رات میں رات تو اپنی ہوتی ہے، فراغت ہی فراغت۔ اسی لئے کہا گیا ہے رات ماں کا پیٹ ہے۔ تاہم شبِ ماہتاب، شبِ ظلمات اور شب غم سخنوروں کی، استراحت میں خلل ڈالتی ہیں لہٰذا ان کے زیادہ تر فرصتی لمحات سخن آرائی میں گزر جاتے ہیں۔ کسی قسم کی افراتفری کے دوران جب ہڑتالیں ہوتی ہیں یا پہیہ جام جیسی بڑی رکاوٹیں آڑے آتی ہیں تو ایسے ہنگامی حالات سے وہ لوگ زیادہ سکون پاتے ہیں، جنہیں مصروفیات کا بوجھ سر سے اتارنے یا پھر بقولِ خلق خدا مرنے کی فرصت بھی نہیں ہوتی ہے۔ بقولِ شاعر؎

جو چاہتے ہو وہ کرتے ہو
پر یہ تو نہیں کہ مرتے ہو

بعض اوقات فرصتی لمحات کے دوران ''دام آوے کام'' کے دھندوں میں مصروف ہونے کے بجائے ''جان ہے تو جہاں'' کے اصول کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں کچھ مصروفیات کے لئے جوں توں کر کے فرصتی اوقات مختص رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ان میں اپنی صحت وصفائی اور ورزش کا مقدم ہونا طے ہے۔ اسی طرح والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ

شوہر کا بیوی کے ساتھ، رشتہ داروں کا اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اور دوست واحباب کا اپنے دوستوں کے ساتھ دیگر مصروفیات کی قربانی دے کر فرصت کے لمحات گزارنا ہر لحاظ سے مفید رہتا ہے۔

ایک مصروفیت ختم ہونے کے بعد جو فرصت ملتی ہے وہ اگر کسی بھولی ہوئی ضرورت کے کام لائی جائے تو پھر سے وہ مشغولیت یا مصروفیت میں بدل جاتی ہے گویا ہر قسم کی فرصت یا فراغت کسی نہ کسی ضروری یا غیر ضروری کام کے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ زندگی میں فقط ایک قسم کی فراغت یا فرصت حفظان صحت کے لئے لازمی قرار دی گئی ہے۔ وہ رفع حاجت کا معاملہ ہے۔ اس نازک انسانی ضرورت کی خاطر بیت الخلا کو فراغت سے جانا، فراغت سے بیٹھنا اور فارغ ہو کر نکلنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

دنیا کے بکھیڑوں سے ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں'' کی مثل دنیا پرست لوگوں کو فرصت یا مہلت نصیب ہونا عنقا ہوتا ہے۔ البتہ مجاذیب کا جہاں تک تعلق ہے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونے کے سبب فراغتوں سے سرشار ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنے بندوں کی نافرمانیوں کو تابع مہلت رکھا ہے۔ اس مہلت یا فرصت کے ختم ہونے کے بعد عتاب الٰہی کا نزول اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح دعاؤں کے مستجاب ہونے سے نزول باراں ہوتا ہے۔

دنیا میں جس انسان کی زندگی کا سفر فرصتوں یا فراغتوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے ہم اُسے فارغ البال شخص تصور کرتے ہیں لیکن فارسی زبان کا ایک شعر ہے۔

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد
اگر باشد بنی آدم نہ باشد

لہٰذا ایک انسان کے لئے دنیا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کی مانند حالات میں فراغت پانا ناقابل عمل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگتا ہے۔تاہم قدرت نے انسانوں کے لئے مرنے کے بعد شہر خموشاں میں فراغت یا فرصت سے رہنے کا محدود عرصہ دراز رکھا ہے۔ایک مصرعہ ہے''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں''۔

فرصتیں یا فراغتیں پانے کے اور بھی بہت سارے مختلف قاعدے اور مواقعے ہیں جن کی نوعیت سرکاری بھی ہوتی ہے اور نجی بھی۔سرکار کی طرف سے جو طریق عمل ملازمین اور عوام الناس کے حق میں مالیاتی فوائد اور رعایتیں دینے کا ہے بالکل ویسا ہی طریق کار چھٹی چھٹکارا آرام،فرصت، فراغت بہم پہنچانے کے لئے مقرر ہے۔جہاں دفتروں،سکولوں،کالجوں، کارخانوں وغیرہ میں کام کرنے والے ملازمین اور تعلیم پڑھنے والے طلاب کے لئے اتوار بطور چھٹی کا دن مقرر ہے۔وہیں تاجر پیشہ لوگوں کے

لئے دکانیں بند رکھ کر آرام کرنے کا دِن کہیں پر اتوار، کہیں پر جمعہ تو کہیں پر منگلوار مقرر رہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں بچوں کو دوپہر کے وقت بریک یا وقفہ کی صورت میں فراغتی لمحات ملتے رہتے ہیں۔ مختلف اعلیٰ تعلیمی اداروں سے رخصت ہونے کے بعد طلاب کو فارغ التحصیل سمجھا جاتا ہے گویا ڈگری یافتہ وغیرہ ہونے کے بعد طالب علموں کی دنیا میں رخصتی ہونے کے لمحات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ رہی بات دفتروں اور دیگر سرکاری و نجی اداروں کی، ان کو بھی لا اینڈ آرڈر کی صورتحال خراب ہونے کے دوران ہڑتالیں، کرفیو، پہیہ جام، تالابندی، کریک ڈاؤن وغیرہ سے لمبی فرصتیں یا فراغتیں ملتی ہیں۔ ایسے حالات میں عوام الناس کو بھی متعدد پریشانیوں کے باوجود اطمینان کی لمبی سانسیں لینے کی فرصت ملتی ہے۔ اس قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں کسی کسی کو ملنے، قرضے چکانے، خبر لینے اور دوڑ دھوپ وغیرہ کرنے کا عمل اپنے آپ ہی ختم ہونے سے فرصتی اوقات بہت پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کئی سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں اور کارخانوں میں شفٹ سِسٹم رائج ہوتا ہے جس کے تحت ملازمین اور ورکروں کو آرام و آسائش کے مواقعے فراہم رکھنے کے لئے شفٹوں میں کام کرایا جاتا ہے۔ اس سسٹم کے نافذ العمل ہونے سے عمومی طور ڈاکٹروں اور نرسوں کو آرام بخش وقفے ملتے ہیں جو ان کے لئے سکون آور ہوتے

ہیں ۔اس طریق عمل سے وہ تروتازہ ہو کر اگلے دن کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔

فرصت سے مراد ڈھیل بھی ہے جو دو طرح کی ہوتی ہے، ایک سرکاری اور دوسری خدائی۔سرکاری ڈھیل کرفیو کے دوران دی جاتی ہے جبکہ خدائی ڈھیل یا مہلت بنی آدم کو بہشت سے نکال کر دنیا میں رہنے کے لیے ملی ہے۔ یہاں آکر انسان دنیاوی دھندوں اور جھنجٹوں میں مصروفِ عمل ہو گیا۔شاید اسی لیے علامہ اقبال کو کہنا پڑا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

آج کل کی مصروفیات مختلف کام دھندوں میں پھنسے اِنسانوں کے لئے سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی ۔ایک بار انگلستان میں ہندوستانی طلاب آٹھ منزلہ عمارت اپنے سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے تو ایک انگریز نے ان سے کہا کہ آپ نے اپنا فالتو وقت ناحق ہی لاحاصل مقصد کے لئے ضائع کیا۔

زبان

دنیا کے مختلف مما لک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں جبکہ علاقائی زبان کو بولی کا نام دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے کبھی مادری زبان، کبھی قومی زبان، کبھی سرکاری زبان تو کبھی بین الاقوامی زبان زیر بحث ہوتی ہے۔

زبان سے مراد انسان اور حیوان کے منہ کے اندر کا ایک عضو جس سے وہ چیزوں کا مزہ معلوم کرتے ہیں۔ انسان اس کی مدد سے بعض حروف کی آواز بھی پیدا کرتا ہے۔ بولی، بات، گفتگو، اقرار، قول، وعدہ، نطق، بیان بھی اسی زبان کی معانی ہیں۔ دراصل قدرت نے بنی نوع انسان کو زبانِ ناطقہ سے نوازا ہے۔ خلیل جبران کا قول ہے ''تمام اعضائے جسمانی میں سب سے زیادہ نافرمان زبان ہے''۔ داناؤں کا کہنا ہے ''زبان ہی حلال ہے، زبان ہی مردار ہے''۔ بعض حضرات تو اس خوف کا اظہار کرتے ہیں کہ زبان کی غلطی سے انسان اپنی جان تک گنوا سکتا ہے۔ اُن کا مزید کہنا ہے ''زبان ہی ہاتھی چڑھا دے، زبان ہی

عُمر کٹوادے'' بہر حال جتنے مُنہ اتنی باتیں۔فی الحال ہم ان محرکات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں جن سے زبان کی کارکردگی ہدفِ تنقید بنائی جاتی ہے۔

چنانچہ دنیا میں ایک انسان اپنی زندگی ایک دستورالعمل کے تحت گزارتا ہے وہ اپنے ہی بنائے گئے آدابِ زندگی کی پیروی کرتا ہے۔اس پورے عمل میں اس کے تمام جسمانی اعضاء شامل ہوتے ہیں۔اس طرح کے طریق کار میں زبان کا چلنا دل اور دماغ کے تابع ہوتا ہے۔زبان وہ تمام باتیں اُگلتی ہے جو منشائے دل ہوتا ہے۔ایسے میں زبان کو ہی قصوروار ٹھہرانا انصاف کے سراسر منافی ہے۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے زبان پر وہی بات آجاتی ہے جس کا دل نے پہلے ہی ارادہ کیا ہو۔البتہ زبان کا ایک نقص ہے کہ اس کے پاس اپنی کوئی سوچ نہیں ہوتی۔کبھی غیرارادی پھسلن کا شکار ہو جاتی ہے تو کبھی مصلحتاً اناپ شناپ بکنا شروع کر دیتی ہے، بعض اوقات انسان ایسی باتیں کرتا ہے جو بعید از سمجھ ہوتی ہیں۔جب ہم کھانے پینے اور خرچ کرنے میں حدود کا تعین کرتے ہیں تو کیا ہم اپنی زبانوں کو وقت وقت پر بس میں رکھنے کے لئے لگام دینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔کسی شاعر نے زبان اور دل کے مفاد میں ایک شعر کہا ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

زبان اپنی قوتِ گویائی کے سبب بنی نوع انسان کے جسمانی اعضاء کی ترجمانی کرتی ہے۔ پس اس کو چاہیئے کہ دل سے مل کر مختلف معاملات کی شیرین بیانی کرے اور بدزبانی سے احتراز کرتی رہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو بھی بات چاہیئے اچھی ہو یا بُری، فقط زبان سے کہنے کی دیر ہوتی ہے وہ زبانِ زدِ خاص و عام ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے ''زبان سے نکلی کوٹھے چڑھی''، عموماً زبان درازی کا عوامی حلقوں میں زیادہ چرچا ہوتا ہے وہ اس لیے کہ انسانوں میں یہ فطرت ہوتی ہے کہ، وہ دوسرے، چاہے وہ ان کے قریبی بھی ہوں، کے تنزل یا بدنامی کے مزے لیتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے بعض لوگ خوش قسمتی سے قادر الکلام کہلاتے ہیں جبکہ بعض زبان بُریدہ اور کچھ لوگ زبان دراز ہوتے ہیں۔ اگرچہ حال احوال کا اظہار زیادہ تر زبان سے ہوتا ہے لیکن بعض حالات کا پتا زبانِ حال سے کہنے سے لگ جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو زبردست مصائب یا بدگوئی سہتے ہیں لیکن زبان سے اُف تک نہیں کرتے ہیں۔ کسی کو زبان دے کر پھر پلٹنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کہاوت سے ظاہر ہے۔ زبان جنے ایک بار ماں جنے بار بار۔ اسی تناظر میں داناؤں کا ایک قول ہے

”زبان بدلنے سے کوچہ بدلنا بہتر ہے“۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر کوئی سیاسی حکمران حلفِ منصب اُٹھاتے وقت فقط اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ اس کی انگریزی یا اُردو یا ہندی زبان میں کی جانے والی بول چال لوگوں کو پسند آئے حالانکہ بعض اَن پڑھ سیاست دانوں کے حلف اٹھانے کی گونج میں ان کے الفاظ ”زبانِ یارِ من ترکی، ومن ترکی نمی دانم“ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ تقریر یا بیان سے زیادہ تحریری بیان یادستاویز قابل اعتبار ہوتا ہے۔ زبانی شہادت یا گواہی سے تحریرِ حلفی بیان مستند قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ کوئی سیاسی لیڈر ہو یا عام انسانوں میں سے کوئی گواہ یا شاہد، دونوں کا اپنے پہلے دئے گئے بیانات یا شہادت سے مکرنا ہمارے اسلاف کے زمانے سے چلتا آیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ”عیاں راچہ بیاں“ کی سہولیت سی سی ٹی وی کیمرہ کی بدولت نصیب ہوگئی ہے۔

ہم دیکھتے آئے ہیں کہ مقابلے کے امتحانات میں امیدواروں کو کاغذ پر تحریر کرنے سے زیادہ زبانی بولنے کا ڈر رہتا ہے۔ دیہات کے سکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل لڑکے اور لڑکیوں کی اکثریت کسی بھی مقابلے میں ایکسپوژر نہ ہونے کے سبب زبانی جواب دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے۔

زبان کا کام مزے لینا بھی ہے۔جس طرح کسی بھی موضوع یا معاملے پر ہر فرد کا اپنا اپنا خیال یا اپنی اپنی رائے ہوتی ہے۔ بالکل ویسے ہی ہر فرد کا میٹھی میٹھی یا تلخ چیزیں کھا کر دیر تک یا تو مزے لیتے رہنا یا بد مزاجی کا مظاہرہ کرنا ایک پرانی عادت ہے۔سالن پکانے کے دوران نمک چکھنا عموماً خواتین کے ذمے ہوتا ہے۔انسانوں کے لئے ایک مذہبی ایڈوائزری ہے کہ وہ کبھی بھی کسی قسم کی سالن یا ضیافت کا مزہ نہ ملنے پر کڑوا کڑوا،تھوتھو، میٹھا میٹھا،ہپ سَپ کرنے سے احتراز کریں۔گویا زبان سے مزہ چکھ لینے کی رسم بھی شرعی قواعد وضوابط کے تابع ہے۔

چونکہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں میں درس وتدریس کا پروگرام چلانا استادوں کی زبانی لیکچر ڈیلیور ہونے پر منحصر ہوتا ہے اور جن کے بیانات کی مجموعی یکسانیت کی جانچ پرکھ کرنے کے لئے ابھی تک کوئی میکنزم یا حکمت عملی بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ استادوں کو اپنے اپنے مضمون میں اُستاد کا قرار دیا گیا ہو ورنہ یوں بھی جب ہم کسی مضمون یا موضوع کو زبانی طور زیر بحث لاتے ہیں اختلافِ رائے پیدا ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

دنیا کے نوجوانوں میں حاضر جوابی ابھارنے کے لئے ذہنی آزمائشوں پر مبنی ''کوئز کنٹیسٹ'' اور ''کون بنے گا کروڑ پتی'' جیسے پروگرام

چلائے جاتے ہیں جن کے تحت ان میں حصہ لینے والوں کے ساتھ سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔ ان پروگراموں کے دوران کئی لوگوں کی زبانیں رک جاتی ہیں، جبکہ گنے چنے لوگوں کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں۔ تاہم ان پروگراموں سے چھوٹے بڑوں کی زبانیں فرفر چلنے کی تربیت پاتی ہیں۔

قدرت نے انسانوں کو اپنے اپنے آبائی وطن کی مادری زبان کا سافٹ ویئر کمپیوٹر کی مانند ازل سے ہی ڈاؤن لوڈ کر رکھا ہے۔ زبان ناطقہ ہونے کے سبب اس کے چلانے میں چارجر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک بات بین الاقوامی طور مسلمہ ہے کہ مادری زبان ہلانے سے نہ صرف ایک فرد کا کام نکلتا ہے بلکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو کھل کر واضح کرتا ہے۔ عجیب صورتِ حال اس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب ایک ہی زبان سے آشنا انسان پردیس جاتا ہے جہاں اس کی حالت یوں ہو جاتی ہے ''گونگے نے سپنا دیکھا من ہی من میں پچھتائے'' اپنے وطن میں گونگے کا اشارہ ہم وطن گونگا ہی سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کی سیاحت سے لطف اندوز ہونے کے لئے ملک ملک کی زبان سمجھنے کے بجائے انٹرنیشنل زبان انگریزی سیکھنا لازمی ہے۔

کتاب

کتنا بڑا المیہ ہے کہ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں فقط پڑھائی جانے والی کتابیں زندہ ہیں وہ بھی طلاب کے جزدانوں اور ہاتھوں میں ہونے کے سبب ورنہ باقی جتنی بھی ہیں، پڑھنے کے دوران لاش گھروں کی مانند لائبریریوں، کتب خانوں اور کتاب گھروں میں زندہ درگور ہیں۔ تاہم تحقیق و تنقید اور تاریخ کے طلاب ان بے جانوں کے لئے بنے لاش گھروں میں جا کر ان زندہ دارانِ شب و روز کے دیکھنے سے مستفید ہو جاتے ہیں۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں ابھی بھی لوگ کتابیں اور اخبارات وغیرہ پڑھتے ہیں، ایک ہماری خلقت ہے جو شارٹ کٹوں کی عادی بنکر سوشل میڈیا کی دیوانی ہو گئی ہے۔ ادھر سے ادیبوں اور شاعروں کو نئی نئی کتابوں کی رسم رونمائی کرنے کا نشہ چڑھا ہوا ہے جو اترنے کا نام نہیں لیتا۔

چنانچہ ڈیجیٹل دنیا میں کتابوں کے نعم البدل کے بجائے تکنیکی الٹ پھیر ہونے پر اہل قلم حضرات سُنی سنائی درس و تدریس سے تذبذب کا شکار ہونے لگے ہیں، لہٰذا اس طرح کی نارسیدگی اور ناسمجھی پر پشیمان ہیں۔ ایک

شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جو پڑھا ہے اُسے جینا ہی نہیں ہے ممکن
زندگی کو میں کتابوں سے الگ رکھتا ہوں

موضوع کو آگے بڑھانے سے قبل کتاب کی معنویت سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس لفظ کی لغوی معانی ہیں نوشتہ، نامہ، پوتھی، نسخہ، جلد، رسالہ، بہی، رجسٹر، بیاض وغیرہ جہاں تک مقدس کتابوں کا تعلق ہے ان میں قرآن پاک سرِفہرست ہے۔ جبکہ توریت، زبور، انجیل او بھگوت گیتا کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ پوری کائینات پر نظریں دوڑانے سے محسوس ہوتا ہے کہ ہر شئے اور ہر ذرہ اپنی جگہ ایک کتاب ہے حتیٰ کہ بنی آدم خود ایک کتاب ہے جس کا چہرہ خاص کر لوحِ پیشانی پڑھنے کے قابل ہے۔ خدائی کمال دیکھیں کہ ایک تختی جسے لوحِ محفوظ کہتے ہیں، دنیا میں ہونے والے ہر فعل کی نسبت ابتداء سے انتہاء تک اس میں لکھ رکھا ہے اور قیامت تک کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔ کیا شان ہے کتاب نام کی کہ خود رب کائینات نے لوح وقلم کے نام سے احکام کی تختی اور اس کے لئے لکھنے کا قلم ازل سے ہی معرضِ وجود میں لایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوحِ مزار یا لوحِ مرقد یا لوحِ تربت یا لوحِ قبر بھی اپنے اوپر لکھی عبارتوں سے کتابوں نہ سہی کتابچوں کے نعم البدل ہیں۔

چونکہ کتاب بھی دلہن کی مانند تخلیق سے طباعت تک کے بناؤ سنگار سے

سج دھج کر کمرہ عروسی کے بجائے منصبۂ شہود پر جلوہ افروز ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد مارکیٹ اور لائبریریوں کی زینت بن جاتی ہے۔ لیکن ڈیجٹل سِسٹم میں اپنی شناخت کھو بیٹھتی ہے۔ اس مخدوش صورتِ حال میں کتابوں کے مصنفین، مولفین، مورخین، ناقدین، محققین، مُترجمین، شعراء اور ناول نگار وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مسلہ یہ ہے کہ ان حضرات کی محنت شاقہ سے تیار ہوئی کتاب کا ڈیجٹل کی دنیا میں جو حشر ہو رہا ہے۔ وہ اس پر کچھ حرفِ شکایت کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کتابی علوم کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ تجربات حاصل کرنے میں مزے ہی مزے ہیں۔ ڈیجٹل نظام کے اندر مختلف علوم کی دیکھا آؤ نہ دیکھا تاؤ" کے مصداق مواد اور صدا بندی انجام دی جاتی ہے، گویا اندھے کی جوڑو کا اللہ بیلی۔

ایک ایسی کتاب جس کا چرچا ہو اور پہلے نہ دیکھی ہو، ہم اس کے غائبانہ دیوانے بن جاتے ہیں۔ کتاب ملنے کا اشتیاق زور پکڑتا ہے، بیشک ایسی کتاب بقولِ کسے خزانہ سے کم نہیں۔

کائینات کے وجود میں آنے کے فوراً بعد دنیا میں الگ الگ قوموں کے لئے پیغمبروں کے مبعوث ہونے اور ان پر الہامی کتابیں نازل ہونے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ لہٰذا دنیاوی کتب انسانوں کے لئے ہر قسم کے علم سے آشنا ہونے کی نعمتِ عظمیٰ ہیں۔ چنانچہ دنیا جب لکھنے کے فن سے آشنا

ہوئی تو پتوں کے چمڑے اور پتھروں پر لکھنا شروع ہو گیا۔ جن کتابوں کے نور سے یہ جہاں روشن ہوا ان کی جلدیں کہاں گاہکوں کی ڈیمانڈ پر شمار کر کے بکنے کا رواج اور کہاں آج تول لینے یا بولی دینے کی نوبت کو پہنچنے کی مجبوری،

کتاب ایک دوست کی طرح ہے پرانی اور بوسیدہ بھی ہو جائے پر ان کے الفاظ نہیں بدلتے۔ کبھی یاد نہ آئیں تو ورق پلٹ کر دیکھئے یہی جانکاری ہوگی کہ "ہم کل جیسے تھے آج بھی ویسے ہی ہیں" کہتے ہیں۔ کتاب دوستی و احترام میں قوم کی تعمیر و تشکیل کا راز مضمر ہوتا ہے۔ کتاب میں کوئی بڑی بات ہو تو کہنے سُنانے کے لئے پہاڑ سے بھی اُترنا پڑتا ہے۔ لیکن سننے، سماعت کرنے کے لئے پہاڑ پر چڑھنا پڑتا ہے گویا لفظوں کا اصلی گھر اور منبع کتاب ہے مگر کمپیوٹر سکرین پر تو اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب قول بیان کیا ہے کہ انسانوں سے زیادہ کتابوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے کیونکہ کتابیں ہم کو بدلنے کا فن سکھاتی ہیں۔ جبکہ انسانی جذبات گھڑی کی سوئی کے ساتھ بدلتے ہیں۔ بقول شاعر۔

فرصت اگر ملے تو پڑھنا مجھے ضرور
نایاب الجھنوں کی مکمل کتاب ہوں

غرض کتاب دوستی مہذب اقوام کی شناخت ہے۔ کتاب زندگی کے

حقائق کو جاننے اور معلومات دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔کتاب کو علم کی حفاظت، ترسیل اور توسیع کا نام دیا گیا ہے۔کتاب دوستی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی ترقی کا زینہ ہے۔جب مطالعہ کتب سے شوق اور لگاؤ ہونا بڑھ جاتا ہے تو کتابیں عشق ومحبت کے دائرے میں آجاتی ہیں۔کسی نے تجربے کی بات کہی ہے کہ ایک اچھی کتاب عظیم روح کی قیمتی خون سے تحریر ہوتی ہے۔اس کو محفوظ کرنے کا مقصد ایک زندگی کے بعد دوسری زندگی کو عظیم روح سے روشناس کرانا ہوتا ہے۔

مقدس کتابوں کے علاوہ اور بھی کچھ کتابیں ہیں جو ہماری زندگی کے اثاثے بن کر ہیں ان میں تقویم یا جنتریاں، تنجیم دانوں سے منسلک علم نجوم اور حکمت وفلسفہ کی کتابیں ہیں، بنی آدم کی زندگی کا سفران اہم کتابوں کی موجودگی کے بغیر ناممکن ہے۔رب جلیل کی طرف سے نکیرین یعنی کہ مردے سے سوال وجواب کرنے والے دو فرشتے(نکیر منکر) دنیا میں بندوں کے اعمال کا اپنی اپنی کتابوں میں اندراج کرنے پر مامور ہیں۔گویا کتاب کا وجود ازل سے ابد تک بلکہ اس سے آگے بھی قائم ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انسانوں کے ہر قسم کے لین دین کرنے کی تفصیلات چاہیئے بہی میں درج ہوں بیاض میں یا رجسٹر میں، تینوں سے مراد کتابیں ہی تو ہے۔

عام طور پر عدالتوں، محافظ خانوں اور دیگر متعلقہ سرکاری ریکارڈ کیپروں کے پاس فیصلہ شدہ مسلیں اور زمینی کاغذات، نقول کاپیاں اور رجسٹریشن ریکارڈ لاکرس اور کمروں میں بند ہوتے ہیں جو کہ کتابوں کے زمرے میں آتے ہیں ۔ ایسے ذخائر ہمارے سرکاری محکموں اور کارپوریشنوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ جنم پتری اور جنم کنڈلی بھی کتابچوں کی صورت اختیار کر کے ذمہ داروں کی تحویلوں میں ہوتی ہیں ۔ سچ کہا ہے ایک شاعر نے ؎

سانس لیتا ہوں میں کتابوں میں
گفتگو شاعری میں کرتا ہوں

لائف سٹائل

اگر ہم لائف سٹائل کے موضوع پر غور و فکر کرنے لگیں تو بہت ساری نئی باتیں منظرِ عام پر لائی جا سکتی ہیں۔ انگریزی زبان کے ایک مقولے کا مفہوم ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی، سوچ لینے سے ایسی ویسی ہوتی ہے۔ چنانچہ کلچر کا لائف سٹائل کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے اور ہمارے معاشرے میں مخلوط کلچر پایا جاتا ہے۔ کسی بھی انسان کا لائف سٹائل اختیار کرنا اس کی سوچ، برتاؤ، اقدار، روش، عادت، مزاج، انفرادی سوچ، اجتماعی صحبت اور معاشرتی پیمانے پر منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک انسان کو بہترین لائف سٹائل کی اس لئے تڑپ رہتی ہے کہ وہ صحیح وقت پر خوشحال زندگی گزارے۔ دنیا میں رشتے اور یاری نبھانا بھی لائف سٹائل ہے۔ لائف سٹائل کئی طرح کے ہوتے ہیں لیکن آرام رساں لائف سٹائل، صحت مند لائف سٹائل اور فضول خرچی کا لائف سٹائل تینوں میں سے صحت مند لائف سٹائل کا اپنانا فائدہ مند رہتا ہے۔ کسی کے رول ماڈل لائف سٹائل کو اختیار کرنے سے انسان کسی حد تک اطمینان کی زندگی گزار سکتا ہے۔ دنیا کا

بہترین لائف سٹائل یہ ہے کہ لوگ اپنی آمدنی میں گزارا کرنا سیکھیں۔

باوا آدم کا زندگی گزارنے کے دوران پرایا لائف سٹائل اختیار کرنا ہم نے کبھی سوچا تھا نہ کسی نے پیش گوئی کی تھی۔ جب اس موضوع پر غور کرتا ہوں تو مجھے ابتدائی آفرینش کا وہ زمانہ یاد آتا ہے جس میں بہشت سے نکال کر آدم کو دنیا میں بسانے کے لئے سراندیپ (سری لنکا) میں برہنہ اتارا گیا تھا پھر جس کی برہنگی کو چھپانے کے لئے انجیر کے درخت کے پتے نے پناہ دی تھی۔ آگے چل کر زمانے نے پلٹا کیا کھایا کہ انسانوں کی آبادی روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضرورتیں تلاش کرنے لگی اور بالآخر خلقتِ خدا امیر، متوسط، غریب اور غربی سطح سے نیچے حلقوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔

لائف سٹائل انسانوں کی زندگی میں ایک ذہنی اختراع ہے جو بچپن، لڑکپن اور ادھیڑ عمر تینوں میں نئی نئی وضع اختیار کراتا ہے، جو کسی فلمی سٹیڈیو میں فلمی کرداروں کے الگ الگ رول کی اداکاریوں کے مشابہ تصور ہوتا ہے، دنیا میں بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کا اعزاز ملا ہے اور فرشتے بھی اس سے مانوس ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس کی نادر خیالی میں بکھیڑے کھڑا کرنے کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال بنی آدم کی فطرت میں کھٹا میٹھا ہوتا ہی ہے، لیکن پھر بھی انسان ہی تو ہے۔ علامہ اقبال نے طویل سفرِ حیات کے موجب آدم زاد کے

لئے نکتے کی بات کہی ہے

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

چنانچہ جس آدم کو دنیا میں آنے کے بعد رہنے سہنے کے لئے جائے مسکن، پہننے کے لئے کپڑے اور اوڑھنے کے لئے بچھونا میّسر نہ ہونے کی صورت میں مشکلیں سہنا پڑی تھیں وہ آج رائیل یا شاہانہ لائف سٹائل کے خواب دیکھتا ہے۔ سماجی زندگی میں طرح طرح کے لائف سٹائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دولت مند گھرانوں اور بڑے عہدے داروں میں کسی ایک کا لائف سٹائل بامِ عروج کو چھونے لگتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ سماج میں ایسے انسان کا رائل لائف سٹائل ہیبتِ سلطانی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس قسم کے گھرانے سے باہمی رسم و رواج اور رشتہ داری قائم کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ دراصل شاہانہ لائف سٹائل کسی بھی شخصیت کو دوسروں کے لئے شجرِ ممنوعہ بنا کے رکھ دیتا ہے۔ کثرت دولت سے لائف سٹائل تو بلندیوں کو چھو سکتا ہے لیکن سکونِ قلب دے نہیں سکتا۔

داناؤں کا قول ہے ''زر آیا، سرخی آئی''۔ قدرتی بات ہے کہ ایک انسان آسودہ حال ہو یا ہو جائے دیکھا دیکھی کی طرف لگ جانے کا بھوت اس کے دماغ پر سوار ہو ہی جاتا ہے۔ اپنے مائنڈ سیٹ پر شاہانہ لائف سٹائل

بنانے کا مضبوط ارادہ رکھنے والا انسان آناً فاناً گاہے سودیشی، گاہے پردیسی بن جاتا ہے۔کون نہیں جانتا کہ پرائے کالائف سٹائل اختیار کرنے سے ایک والدا پنے نوزائید بچے کی یومِ پیدائش کی تقریب جلتی موم بتی کی آغوش میں ایک بڑا کیک کاٹنے اور ہیپی برتھ ڈے کہنے کی مسرت بھری گونج میں منانے کی رسم انجام دیتا ہے۔ایک باراس لائف سٹائل سے مانوس ہوئے گھرانے کبھی بھی اسے تبدیل کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتے ہیں۔

جب سے لوگ اس حقیقت سے آشنا ہو گئے ہیں کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا، بہت ساروں کے مزاج پھیرنے لگے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات کوایک شاعر کا یہ مصرعہ ”نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی“ کچھ راس نہیں آیا ہے۔آئے بھی کیسے؟ انسانوں نے تو اپنے جسم کو نئی گاڑی کی چیسز یعنی کہ ڈھانچے کے باڈی بلڈنگ کی مانند ملبوس اور وضع قطع کرنے کی ٹھان لی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے، بقولِ کسے کہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی کے خواہش مند باوا آدم نے بغاوت کے جذبے سے ممنوع پھل کھایا تھا، جس نافرمانی پر اُسے جنت سے نکال کر زمین پر اتارا گیا تھا کیا اب دنیا کی عالیشان کوٹھیاں، شاندار بنگلے، بیش قیمت گاڑیاں وغیرہ دیکھ کر اپنے طرزِ زندگی میں قرینے سے بے قرینے ہونے لگا ہے۔اگر ہم غور کریں تو سو باتوں کی ایک بات کہ انسان کے

اختیارات محدود ہیں۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
آپ جو چاہیں سو کرے ہم کو عبث بدنام کیا

مرد و خواتین کا شاندار ملبوسات خریدنے کے لئے بازاروں میں دکانیں چھان مارنا اور وضع قطع کے ضمن میں پلاسٹک سرجری کے ذریعے مصنوعی اعضاء لگوانا یا مصنوعی بال لگوانے کے ماہرین تلاش کرنا یا بال کٹائی کروانا یا چہرے کے بال نوچنا یا داڑھی بنوانا یا بال رنگنا اور بھنویں وغیرہ بنوانا لائف سٹائل کے وہ لوازمات ہیں جن سے وقتی طور انسانوں کی آرائش و زیبائش تو ہوگی مگر راحت رسائی نہیں۔ چہل پہل والی زندگی گزارنا انسان کی فطرت ہے۔ اسی لئے انسانوں کا رات گئے تک بازاروں میں گھومتے رہنے سے تماشے دیکھنا تو نصیب ہوتا ہے لیکن سکونِ قلب ملنا محال ہوتا ہے۔

ایک عام قول ہے کہ ’’مچھیروں نے جال پھینکنا سیکھ لیا جبکہ مچھلیوں نے اچھل کود سیکھی‘‘۔ اس قول کا حوالہ دینے کے پیچھے میرا یہ مقصد ہے کہ اُن گنے چنے حضرات کے لائف سٹائل کا ڈارک سائڈ بیان کروں جس کے اختیار کرنے میں ان کی نیت سادہ وضع ہونے کا ناٹک کرنا ہوتا ہے، ان کے ملبوسات عمامہ یا ٹوپی اور دوشالہ ہوتا ہے، عموماً فقیری کے بھیس میں سادہ

لوح لوگوں کو پھنساتے ہیں ۔سچ کہا ہے کہ داناؤں نے کہ ’’آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر‘‘ الغرض آدمی جب اپنے مطلب میں اندھا ہوتا ہے تو پھر گلہ کاہے کا؟

اپنے وطن میں کیا امیر، کیا غریب، کیا پڑھا لکھا، کیا اَن پڑھ غرض ہر ایک انسان کو اپنے بچے کا مستقبل میں ڈاکٹر بنتے دیکھنا ایک رواج بن گیا ہے جو اَب ان کے لائف سٹائل کا جزوِلاینفک بنا ہوا ہے۔

آج کل شعر وادب کی دنیا کے لوگوں کا لائف سٹائل کہنہ مشق اور نو آموز ادباء وشعراء کے مابین باہمی عدم تعاون کا سبب بنا ہوا ہے۔ جس سے اپنوں کی حوصلہ شکنی اور غیروں کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ دراصل اس ضمن میں اَنا اور آپا دھاپی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ ذرایع ابلاغ کے نوجوان کارندے اپنے اپنے لائف اسٹائل کے طور لمبے اور گھنے بال رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

خوشامد یا چاپلوسی

خوشامد کو خایہ بوسی بھی کہتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بنی نوع انسان اپنے ہر کام میں زیادہ تر سود و زیاں کی سوچ میں مصروفِ عمل کیوں رہتا ہے۔ اگرچہ خوشامد کے مفہوم میں خایہ بوسی، چاپلوسی، جھوٹی تعریف جیسی اصطلاحیں پڑھنے کو ملتی ہیں لیکن مبالغہ آرائی اِن دونوں نوعیت کی معانی کی مخلوط شکل ہے۔ جب کوئی خدا کا بندہ اپنے سے بلند رتبہ شخصیت یا صاحب منصب کے سامنے محض ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لئے عاجزی وانکساری کرنے لگتا ہے یا اس کو اس کے حق سے زیادہ سراہنے لگتا ہے تو ایسی صورتِ حال میں داناؤں کے بقول خوشامد سے آمد ہے۔ مگر ایسی آمد سے مداح خوان کی عزت دو کوڑی کی نہ رہتی ہے۔ اسی لئے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ضایع نہ کر اپنے الفاظ ہر کسی کے لئے
خاموش رہ کر دیکھ تجھے سمجھتا کون ہے

چنانچہ ہم اکثر والدین کو خوشامدی کا الزام اس وجہ سے لگاتے آئے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ خوشامد درآمد کرتے ہیں۔ ایسی خوشامد میں بے جا تعریفوں اور کھوکھلے وعدوں سے بعض بچے بڑوں کے

سروں پر چڑھ چڑھ کے بولتے ہیں اور پھر کنٹرول سے باہر ہو کر طرح طرح کی من مانیاں کرتے ہیں، گویا ''چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا''۔

جہاں تک ''خوشامد سے آمد ہے'' والی کہاوت کا تعلق ہے۔ اس ناہنجار کردار سے دلالی کی مانند پیسے اور روپے مل جاتے ہیں۔

ایک زمانے میں نادان لوگوں پر خوشامدی کلمات سُن کر پھولے نہ سمانے کا الزام لگایا جاتا تھا لیکن آج کے اِس کروٹ بدلے زمانے میں دانا لوگ بھی اپنی مدح سرائی پر اندر خانے بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ بہر حال ایسے لوگ فطرتاً یا مصلحتِ وقت کے بموجب سیانے بن جاتے ہیں۔ اور ایک قول کی رو سے سِیانا، کوّا کو کھاتا ہے۔ آدم زادوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کی غرض باولی ہوتی ہے اور اگر انہیں اپنی اپنی غرض نکالنے کے لئے گدھے کو باپ بھی بنانا پڑے وہ کبھی اسے اپنی شرمساری نہیں سمجھیں گے۔

خوشامد کا ہم معنی لفظ چاپلوسی ہے۔ دونوں الفاظ میں مجھے اتنا ہی فرق لگتا ہے جتنا کہ اس فارسی کے ضرب المثل سے عیاں ہے

''چہ نسبت خاک را با عالم پاک، کجا عیسیٰ کجا دجالِ ناپاک''

ہم سب جانتے ہیں کہ بعض الفاظ اپنی ہیتِ ترکیبی کے لحاظ سے یا تو تلخ، تند، تیز دِکھتے ہیں یا مزاجاً نرم ملائم معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا خوشامد کا لفظ موخر الذکر کیٹگری میں آتا ہے جبکہ چاپلوسی کا لفظ اول الذکر میں آ کر سیدھے

سیاست دانوں اور بابو لوگوں کے لئے فِٹ دکھائی دیتا ہے۔اس ڈپلومیٹک لفظ کی مدد سے سیاست گری اور حکمرانی پروان چڑھتی ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کی بول چال میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے، جھوٹے کلمات کے برمحل استعمال سے خوشامد درآمد کا ڈھنگ اِس حد تک نرالی کیفیت اختیار کرتا ہے کہ خوشامدیوں اور مخاطبین کے مابین اپناہیت کا جذبہ موجیں مارتا ہے۔چمچہ گیری اسی قبیل کی ایک اہم کڑی ہے۔اس کے ساتھ ہی سماجی زندگی میں بڑے منصب والے لوگوں کی کہیں پر بھی آمد کو پر حد سے زیادہ گرم جوشی دِکھانا یا زوردار مصافحہ کرنا خوشامد کے زمرے میں آتا ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ خوشامدی کلمات سنکر اکثر شخصیات یا صاحبِ منصب لوگوں کے چہروں پر گویا سورج اپنی تمازت کے ساتھ طلوع ہو جاتا ہے۔ان کے بدن کا انگ انگ خوشی و انبساط کی آڑ میں یوں پھیل جاتا ہے جیسے ان پر طمانیت کا انجن پھیرنے کا کام کیا گیا ہو جس سے سڑک کی مانند اس کے لب سمیت دانت بھی اپنی چمک دکھاتے ہیں۔

چنانچہ خوشامد یا چاپلوسی غیر معروف صورت میں عالمی سطح پر رائج الوقت ہے جس کی مثالیں لگ بھگ دنیا کے ہر ملک میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔تاہم انتہائی حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسے واقعات میں جو کچھ خوشامد کے طور روبہ عمل لایا جاتا ہے اس کی تشہیر کچھ دوسرے موضوعات کی شکل میں عیاں ہے۔بہت ساری

سرکاری و نیم سرکاری تقریبات میں اینکرنگ، خوش آمدید، صدارتی خطابات، تقاریر، رسمِ رونمائی، مشاعرے، استقبالیہ، بحث و مباحثے، ایامِ ولادت وصال وغیرہ کے پروگراموں میں مبالغہ آرائی کی حد تک خوشامد یا چاپلوسی کی باتیں کی جاتی ہیں۔ الغرض اس قسم کی ادبی، ثقافتی، دینی اور علمی تقاریب کے دوران اکثر حقداروں کو نظرانداز کیا جاتا ہے جبکہ منظورِ نظر حضرات اور مصلحتی زاویہ نگاہ لوگوں کی حد سے زیادہ تعریفیں کی جاتی ہیں۔ کسی بھی شخص کے حق میں زیادہ سراہنا ہی خوشامد ہے جبکہ کسی حقدار کی کمی کوتاہ بیانی کو لوگ ضد اور حسد کا نام دیتے ہیں۔

دفتروں کے عیار اور موقع پرست ملازمین ہر نئے افسر کی آمد پر اپنی زوردار تقاریر سے ماحول کو بدل کر رکھ دیتے ہیں جس سے وہ ایسے آفیسر صاحب کو اپنے شیشے میں ڈھال کر اطمینان کی سانسیں لیتے ہیں۔

خوشامد کا ایک اور انوکھا طریقہ ہے اپنے خاندانوں میں بڑوں کا اپنے چھوٹوں اور دوستوں کو اور صاحب منصب شخصیات کا اپنے بعض ماتحتین کو کسی کام کے کرنے کے لئے بلاتے وقت نام لے کر پکارنا۔ کیونکہ اس طریقہ کار سے نہ صرف چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے بلکہ وہ نہایت لگن کے ساتھ احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ کسی بڑے کی طرف سے اپنے کسی چھوٹے یا دوست کو اصلی مگر مختصر نام سے پکارنے کو لوگ چھوٹے یا ماتحت کو بڑے یا صاحبِ منصب کا قریبی آدمی تصور کرتے ہیں۔